www.urduchannel.in

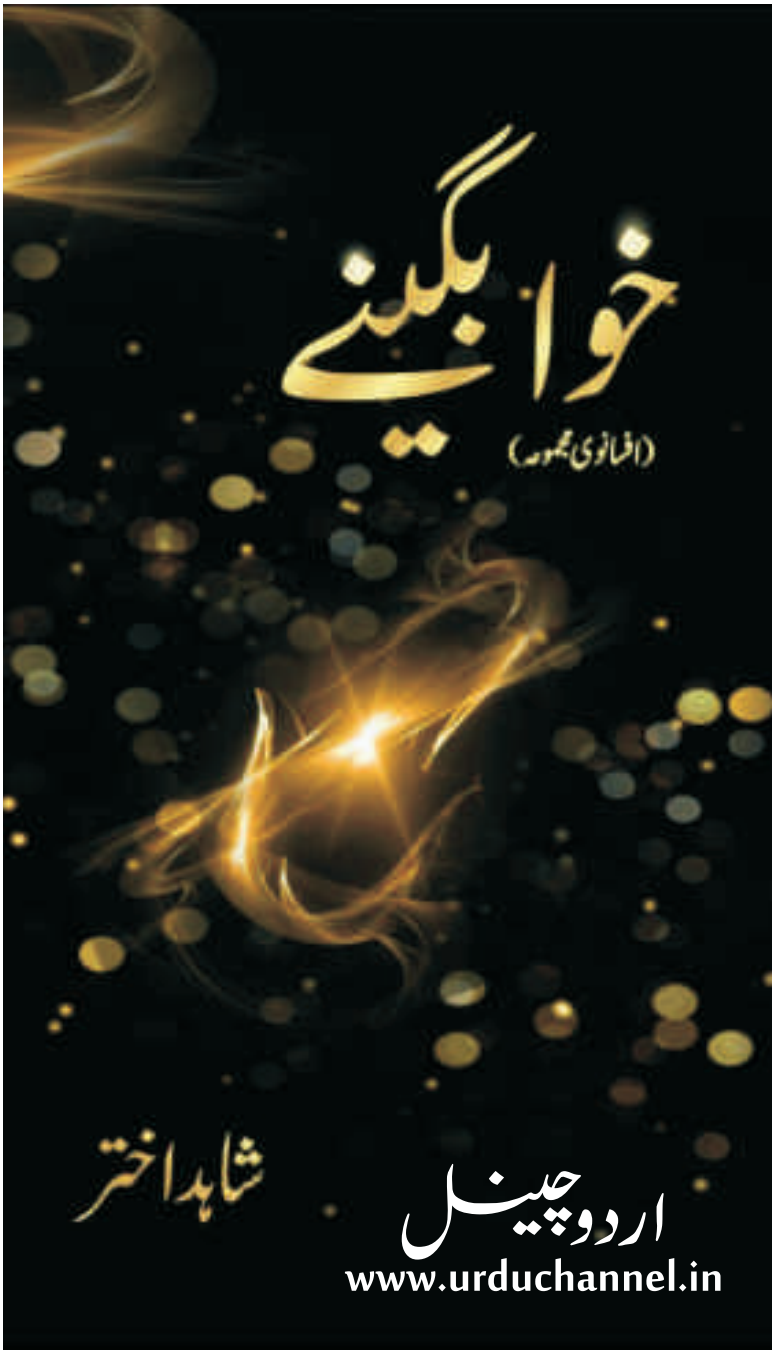

www.urduchannel.in

خوابگینے

(افسانوی مجموعہ)

شاہد اختر

www.urduchannel.in

ضابطہ: شاہد اختر

نام کتاب : **خوابگینے** (افسانوی مجموعہ)

مصنف : شاہد اختر

پتا : 227/2، جوہی لال کالونی، کانپور (یوپی) ۲۰۸۰۱۴

موبائل نمبر: 0091-9450143117

ای میل :

طلوع اول: 2016ء

قیمت : 200/روپے

تعداد : 500

صفحات : 188

کمپوزنگ : محمد وسیم اکرم، رانچی +91-8252169678

سرورق :

مطبع :

ناشر : ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی

www.urduchannel.in

فہرست

☆	شاہد اختر کا افسانوی آئینہ	مہدی جعفر	08
1	حساب		16
2	کتا		30
3	خرگوش		43
4	بڑا گھر		53
5	خوابگینے		65
6	مٹرو		75
7	درخت		85
8	دو پیر کا گھوڑا		95
9	گول		103
10	شناخت		117
11	آزادی		131
12	تشنگی		141

www.urduchannel.in

13 دروبام 151
14 تجویز 163
15 چھوٹے بڑے دائرے 170
❁ مشاہیر کی آرا 184

❁❁❁

شاہد اختر کا افسانوی آئینہ

مہدی جعفر

شاہد اختر کے افسانے لمحۂ موجود میں سانس لیتے ہیں۔ان کے یہاں آج ہے، اپنی پوری شدّت کے ساتھ۔آج کی تلاش ہے خواہ امروز کے تہذیبی نشیب میں اُتر جانے کا مظاہرہ ہی کیوں نہ کر رہی ہو۔ان کے یہاں اگر کہیں گزرتے ہوئے کل کی جھلک ہے تو یہ شکل آج کے آئینے میں نظر آتی ہے۔

شاہد اختر کے افسانوں کا آج دراصل آج کی خبر ہے یا دوسرے لفظوں میں تاریخ کی بالائی سطح کا تموج ہے جس میں انسان کی ملکی اور بین الاقوامی سیرت اور معاشرت مقلوب ومنفعل ہے۔عموماً وہ تاریخ کو اپنے بیان کا محور نہیں بناتے، نہ وہ تاریخ کی تاریخیت سے اخذ کرتے اور اسے نمایاں کرتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں، نہ وہ تاریخ کی جھلکیاں پیش کرتے ہیں جب کہ یہ ان کے بیش تر پیش روؤں اور ہم عصروں کا شیوہ رہا ہے۔مگر اُن کی تخلیقات میں جو کچھ ملتا ہے، اس میں شامل ہے، وہ بھی جس سے ہمارا دور گزر رہا ہے خواہ ہم محسوس کریں یا نہ کریں۔ان کے افسانوں میں شہر (خصوصاً شہرِ کانپور) کا عکس، عمل اور ردِّ عمل ہے۔

میں نے حال ہی میں انتظار حسین کے افسانوی اپروچ اور نئی نسل کے اپروچ کے فرق کو بنیاد بنا کر یہ دیکھنے کی کوشش کی تھی کہ انتظار حسین نے اپنے اوّلین افسانے ''قیوما کی دکان'' میں کون سا رُخ اختیار کیا ہے۔ اس میں بڑی حد تک کہانی کی حقیقت پیش کی گئی ہے۔ شاید ہی کوئی استعارہ شامل ہو اور اگر ہے تو وہ افسانے میں پیوست اور سرایت کر گیا ہے۔ اس میں علامت سازی نہیں ہے، علامتی امکان ضرور ہے۔ جس طرح سیدھے سادے بیانیہ کی ترقی کا امکان موجود ہے۔ یہ تو پریم چند کے نفسیاتی سلوک اور راست انداز بیانیے سے انتظار حسین کا ردِّ عمل تھا جس نے آگے چل کر انھیں علامتی میدان میں اُتار دیا، جہاں انھیں اپنے مینا و جام پیدا کرنے میں خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی۔ پھر ایک سلسلہ نظر آتا ہے۔ انور سجاد، بلراج مین را اور سریندر پرکاش نے جداگانہ اسالیب وضع کیے اور نئی تکنیک، ٹریٹمنٹ اور پراسس اختیار کر کے افسانے کو مختلف انداز کا علامتی اور تجریدی موڑ دینے میں کامیاب ہوئے۔ یہ سب ہوا مگر انتظار حسین نے جو نئی تخلیقی شروعات کی تھی، اس میں ایک جہت کو ترقی دینے کی گنجائش تھی، وہ رہ گئی۔ یعنی ''قیوما کی دکان'' کی بہ راہِ راست اور غیر علامتی راہ انھوں نے خود کھودی۔ جس میں Subjective fiction سے زیادہ Subjective faction کو سمجھنے سمجھانے، درک و احساس کی کوشش ہوتی۔ معروض تو انتظار حسین کے یہاں خوب ملے گا مگر نفسیاتی حقیقت شناسی (Psychological faction) کو اظہر کر دینے سے وہ اپنی تخلیقی وجوہات کی بنا پر عذر خواہ رہے۔ وہ راستہ جو چھوٹ گیا تھا، اس کی حقیقت آگاہی اور اس کی حقیقت سازی پر عصر فن کار خصوصاً شاہد اختر گامزن ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس دشتِ جنوں کی راہ پیمائی اور آبلہ پائی کرنے والوں کو کہاں سرد و گرم پانیوں کے چشمے دستیاب ہوتے ہیں۔

شاہد اختر کردار سازی اور بیانیہ کی تخلیقی روئیدگی کے لیے نفسیات کے اس عمق سے

تعلق حاصل کرتے ہیں جہاں جنس فن بن جاتی ہے۔ جنس ایک فطری شے ہے اور فطرت فن نہیں ہوتی، وہ فطرت ہی ہوتی ہے۔ فطرت کے حسن کو اس کے غیر حسن سے جدا کر کے نمایاں کرنا فن کاری ہے مگر اس کے غیر حسن کو تخلیقی سعی سے فن کے درجہ تک پہنچا دینا فن کار کی کاوشِ جاں ہے۔ فن کار کی حیثیت سے شاہد اختر نفسی حقیقت شناس کا رول ادا کرتے ہیں۔ مثلاً:

[۱] ''ہر چند کہ کہیں کچھ کھٹک رہا تھا جس کی وضاحت وہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ حیدر کو محسوس ہو رہا تھا کہ وہ مسلم جو دہلی سے اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھ کر آیا تھا اور یہ جو اِس وقت آنکھوں کے سامنے ہے، داڑھی مونچھوں کے علاوہ بھی کچھ فرق آیا ہے۔

کچھ ہی دن گزرے تھے کہ بچی کھچی داڑھی بھی صاف کر دی۔ جانتا تھا کہ اس سے نجات کا تیر بھی اس کے ترکش میں موجود ہوگا۔ مسلم کے بدلے حلیے پر اُس کا حیرت زدہ ہونا بڑا فطری تھا۔ اتنے کم وقت میں کوئی اتنا تبدیل کیسے ہو سکتا ہے؟ ہونٹوں پر خاموشی کی مہر ثبت کیے وہ مسلم کی ہر بات کو مارک کر رہا تھا کہ باتھ روم میں جاتے وقت کتنے کتنے لوشن اور کریم کی شیشیاں جاتی ہیں۔ شیو تو خیر وہ ہر روز کرنے لگا تھا۔ داڑھی بلکہ جھاڑی کے پیچھے سے ایک اچھی خاصی شکل کا نوجوان نکل آیا تھا۔ یہ روز بہ روز ہوتی ہوئی تبدیلیاں کس محرکات کا پیش خیمہ تھیں۔ حیدر اَب تک ناواقف تھا۔ آٹھ سو ریال پانے والا مسلم دو ہزار ریال کیسے خرچ کر رہا تھا؟'' (الرشید یان)

[۲] ''عورتوں کی ہم جنسیت کے بارے میں عام طور سے لوگوں کو غلط فہمی ہے کہ ہل کے بغیر جیسے کھیت کی جُتائی ممکن نہیں، ویسے ہی فصل کی کاشت کے لیے ہل کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا مگر بات خالی مٹی کے سوندھے پن سے محظوظ ہونے کی ہو تو ہل کی کیا ضرورت؟ مٹی کی پرتیں تو چیونٹی بھی اُتار سکتی ہے۔ مرد کتنا ہی مشّاق اور تجربہ کار ہو، عورت کی

تسکین کو اتنی اہمیت نہیں دیتا جتنی کہ ایک عورت دیتی ہے۔اس بے چارے کی تو ساری تگ ودَو، سارا جوش، ولولہ، آتشی سیرابی کی ایک ساعت تک ہی محدود ہے۔ اتصال کے اس لمحۂ خاص کے بعد عورت کتنی ہی خوب صورت اور جان دار ہو مرد رجوع نہیں کرتا۔عورت کے جسم کی مرکزیت عورت سے بہتر کون جان سکتا ہے۔'' (سکسٹی نائزرز)

[۳]''اب تو خیر اس کے رشتے آنے بند ہو گئے تھے۔تیس سال کی عمر میں لڑکی کا رشتہ اس طبقے میں تو عام طور پر نہیں آتا۔اب اگر آ بھی جائے تو کیا فائدہ۔ وہ خود منع کر دے گی.....امنگوں کا قافلہ تو بہت پیچھے چھوٹ گیا تھا.....اب تو آئینے کے سامنے بھی جاتے ہوئے ڈر لگتا۔ یہ کون سی پروین ہے۔اتنی کمزور.....راتوں میں جاگنے اور رونے کی وجہ سے آنکھیں بے رونق ہو گئی تھیں.....جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی چاہنے والوں کی بھیڑ اُس کے آگے پیچھے تھی۔اس وقت حالات کچھ اور تھے۔اشاروں سے چراغ جلتے.....اب سوچتی ہے تو سب کچھ کتنا عجیب لگتا ہے جیسے کسی اور کی بات ہو.....والدین کا اعتماد مجروح نہ کرنا اگر اطمینان بخش تھا تو نفسیاتی خواہشات کا گلا گھوٹنا بے چین بھی کرتا۔بدن کا کساؤ کچھ ڈھیلا پڑ گیا ہو مگر اس کے جو اَپنے تقاضے تھے وہ تو ویسے ہی سخت تھے.....صبح ہوتے ہی زندگی کی طرز بدل جاتی، کوئی شک بھی نہیں کر پاتا کہ رات کس طرح گزری ہے۔آنکھوں کے پپوٹوں پر ورم کے کئی بہانے اس کے پاس تھے.....جب مذہبی اور سماجی بیریز توڑنے کی اُس میں خود ہمت نہیں تھی تو کسی اور کو قصوروار کیوں ٹھہرائے؟

''کیا ہو گیا ہے اُسے؟'' تجسس سے انھوں (خالہ) نے مونٹی (مرغی) کی طرف دیکھا۔ذرا سی دیر میں اس نے خالہ کو پوری تفصیل بتا دی۔ سنتے ہی بولیں۔''مونٹی کڑک ہو گئی ہے۔انڈے تو سارے تم لوگ ہضم کر گئی ہو گی۔اب اسے کسی مرغے کے پاس بھیجو۔ جب تک جوڑا نہیں کھائے گی، ٹھیک نہیں ہو گی۔خالہ آپ بھی.....بس پروین کا منھ کھلا رہ

گیا تھا۔سویرے اُٹھ کر اُس نے مونٹی کا پنجرا کھولا اور زبردستی اسے باہر نکالا۔ پردہ ہٹا کر اسے گلی میں چھوڑ دیا۔اس سے پہلے کہ وہ پلٹتی ایک چتکبرا مرغا جانے کہاں سے تیزی سے بھاگتا ہوا آیا۔اس کی کلغی چونچ میں دبائی اور بس سرکش ضدّی مونٹی نے ہتھیار ڈال دیے۔ اتنا آسان ہوتا ہے یہ سب۔وہ غور وخوض کرنے لگی۔کوئی احتجاج نہیں۔

اماں نے کہا۔''بیٹا دال میں نمک کچھ کم ہے؟''

''تو میں کیا کروں خود پکا لیا کریں۔'' تقریباً چیخنے کا سا انداز تھا اس کا۔ برسوں کا روکا ہوا بند بہہ نکلا تھا۔''بہت کر لیا میں نے چاکری۔اب اور نہیں ہو گا مجھ سے۔ میں بھی انسان ہوں۔آخر میرے بھی کچھ ارمان ہیں۔ کچھ خواہشات ہیں۔'' کوں کوں اچانک قفس کے انداز سے آواز آئی تھی۔''

جزئیات نگاری میں شاہد اختر، سید محمد اشرف سے قریب ہیں۔دونوں فن کاروں میں بیانیہ علاقے کا فرق ہے مگر ایک ایک تفصیل پر نظر رکھنا اور اُسے دلچسپی کا ذریعہ بنا دینا دونوں کا طریقۂ کار ہے۔اشرف اپنی کمند فضا پر ڈالتے ہیں شاہد نفس پر۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاہد اختر منٹو جیسے کرافٹ مین کی تخلیقات سے اپنے افسانوی فن کی تحریک لے رہے ہیں۔ جہاں جنسی نہج پر نفسی آئینہ گری ہے۔ان کے افسانے عموماً اور ''ربو'' کے دو ٹکڑے خاص طور پر اِسی جانب اشارہ کرتے ہیں:

[۱]''ایک دن جاوید نے ربو سے کہا کہ'' یہ تمہارے اوپر کوئی کہانی لکھنے کے موڈ میں ہیں۔'' آنکھیں اُٹھا کر اُس نے میری طرف دیکھا۔ سچ بات تو یہ ہے کہ میں اس سے خوف کھانے لگا تھا۔سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا بولوں۔اسی وقت وہ گویا ہوئی۔''منٹو بننا چاہتے ہیں۔'' جملہ سن کر مجھے بے پناہ ندامت کا احساس ہوا۔سوچنے لگا یہ کارِزیاں ایسے بھی ذلیل کروا سکتا ہے۔''ہم لوگوں (ہم طوائفوں) میں ایسی کون سی خاص بات ہوتی ہے جو

www.urduchannel.in

آپ حضرات گھریلولڑکیوں کے مقابلے میں ہم لوگوں کو ترجیح دیتے ہیں۔شاعر شاعری کرنا چاہتا ہے۔آپ کہانی لکھنا چاہتے ہیں۔ایک ایسی تخلیق جو شاہ کار کہلائے۔مرنے کے بعد بھی شناخت قائم رکھے۔ویسے شناخت کا مسئلہ اتنا آسان بھی تو نہیں۔"

[۲]"تم سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔اگر تمھیں بُری نہ لگے تو۔" "ضرور پوچھیے۔میں وعدہ کرتی ہوں کہ بُرا نہیں مانوں گی۔" "ایک دن تم نے منٹو کا نام لیا تھا۔میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ منٹو کو کیسے جانتی ہو۔" میرے سوال پر حیرت سے اُس نے مجھے دیکھا۔پھر مسکرائی۔بڑی پُر اسرار مسکراہٹ تھی۔"سوگندھی، سلطانہ، موذیل وغیرہ کی وجہ سے۔" کہہ کر اُس نے گہری سانس لی۔"

سوگندھی، سلطانہ، موذیل کی طرح ربو بھی جنس آلود افسانوی علاقے کا کردار ہے اور فن کار نے اس علاقے میں ایک حقیقی جگہ (Real space) خلق کرنے کی تحت الشعوری کوشش کی ہے۔اس علاقے میں کہیں پر مرزا محمد ہادی رسوا کی 'امراو جان ادا' بھی تلاش کی جا سکتی ہے۔میرا خیال ہے کہ منٹو اور اس کے افسانوی کرداروں کے نام شاہد اختر نے صرف "ربو" میں لیے ہیں۔شاید افسانے کی تخلیقی ضرورت تھی یا ہو سکتا ہے جنس کے ٹریٹمنٹ کے سہارے کے طور پر منٹو کا ذکر افسانہ نگار نے کر دیا ہو۔اس کا عندیہ یہ نہ ہو کہ وہ منٹو کا تتبع کرنا چاہتا تھا۔یہ بات میرے خیال میں اس لیے آئی کہ شاہد اختر جنسیت کو فن بنانے کی آڑ میں نفسی حالت کو فن بناتے ہیں۔منٹو اور شاہد اختر میں ایک بنیادی فرق (جو شاہد اختر کے دور کے قاری کے لحاظ سے ہے) بہر حال ہے۔منٹو کے یہاں کل تھا، آج شاہد اختر کے ہاتھ میں آیا ہے۔منٹو کے یہاں نفسی آئینہ گری ہے۔شاہد کے یہاں نفسی حقیقت بیانی ہے۔منٹو کے یہاں جنس بازار ہے، اس کا استعمال اور استحصال ہے۔جب کہ شاہد اختر کے یہاں یہی جنس ایک قدرتی مظہر (Phenomenon) کے نمایاں عمل اور ردِ عمل سے

تربیت پاتی ہے۔یہ جہت (Dimension) شاہد اختر کے لیے حوصلہ افزا ہے۔منٹو واقعہ نمائی پر زیادہ بھرپور توجہ دیتا ہے۔شاہد اختر تفصیلات پر اپنے اپنے طرز اظہار کی مناسبت سے دونوں غیر ضروری بیان کو حتی الامکان خارج کرتے ہیں۔منٹو کے فن میں متحرک کرنے کی صلاحیت شاہد اختر کو یقیناً متاثر کرتی ہے۔منٹو کی قوت کا ماخذ کیا ہے؟ کیا یہ بیان واقعہ ہے، واقعی بیان ہے، صورتِ حال کی صورت گری ہے، پلاٹ کی تشکیل ہے، کردار نگاری ہے، طرزِ بیان ہے جس میں زبان شامل ہے یا کچھ اور ہے جو پردۂ خفا میں ہے۔مگر یہ بات صاف نظر آتی ہے کہ منٹو کی طرح شاہد اختر اپنے قاری کو ایسے علاقوں (نفسی علاقوں) کی گشت کراتے ہیں جو عموماً عام نظروں سے پوشیدہ ہیں۔چوں کہ منٹو کے دور کے لحاظ سے زبان و بیان کوئی مسئلہ نہیں ہے اس لیے کہانی بنا لینا، کردار، پلاٹ اور واقعہ پر گرفت اور روانی قائم رکھنا ایک کھیل بن جاتا ہے۔

افسانہ "ربو" کا آخری موڑ دلچسپ ہے۔فن کار عورت کے بدلہ لینے کی نفسیات کا فائدہ اُٹھا کر اُسے جنسی حربے کے طور پر پیش کرتا ہے۔"ربو کو ایڈز" ہو جاتا ہے۔وہ پولیس والوں کو Entertain کرتی ہے۔انھیں یہ بیماری منتقل کرتے ہوئے ان کے ہوس بھرے کرتوتوں سے انتقام لینے کی لذّت محسوس کرتی ہے۔فن کار نے بڑی خوش اسلوبی سے اس کردار کا اختتامیہ تشکیل کیا ہے۔یوں بھی شاہد اختر ہر افسانے کے اختتام کو بہت اثر خیز بنا دیتے ہیں۔دوسری طرف فن کار اپنے بیان کو زینہ بہ زینہ ترقی دیتے ہوئے آگے بڑھاتا ہے۔

جنسیت کا ٹریٹمنٹ ان کے ہم عصر اور قریب ترین پیش رو افسانہ نگار م۔ناگ، شموئل احمد اور دوسرے ہم عصر محسن خان، خالد جاوید، مشرف عالم ذوقی، غزال ضیغم اور دیگر افسانہ نگاروں کے یہاں تو جنس کا سلوک ہے ہی نہیں یا اگر ہے تو وہ افسانے کا دھرا نہیں بنتا۔

www.urduchannel.in

شاہد اختر نے تانیثی افسانے (Logocentric Stories) بھی لکھے ہیں (ربو، ایک بلی کی موت، مونٹی)۔ ''سیکسٹی نائرز''، ''مونٹی'' اور ''ربو'' میں عورت کا زاویۂ نظر کارفرما ہے۔ ان میں نسائی کوائف کا اظہار ملتا ہے۔ انھوں نے ''الرشدیان'' جیسا تذکیری (Phalocentric) افسانہ بھی تخلیق کیا ہے۔ ''مونٹی'' میں جانور کی جبلت کو افسانوی نفسیات کا متوازی آئینہ بنایا ہے جس میں Parallelism ہے۔ ''الرشدیان''، ''برف پر ننگے پاؤں'' اور ''سوسمار'' بین الاقوامی ساخت رکھتے ہیں اور ملکی سرحد کے باہر نکل جاتے ہیں۔ یہ فن کار کی پہنچ کی چغلی کھاتے ہیں۔ شاہد اختر اپنے فن کی راہ سے بین الاقوامی مذہبی سیاہ کاریوں کا پردہ فاش کرتے ہیں اور عام معاشرتی آئین کو آئینہ دکھاتے ہیں۔ دنیائے فانی کے یہ ایسے لاینحل مسائل ہیں جہاں بس فن کار کی نظریں اور فنی قدریں کام کرتی ہیں۔

شاہد اختر کے بیان میں ان کا اپنا تخلیقی گھناپن جاری و ساری ہے۔ شفاف اظہار کے ساتھ روانیِ بیان قرأت خیزی پیدا کرتی ہے اور ترسیل میں کوئی رُکاوٹ مانع نہیں آتی۔ وہ جگہ جگہ چھپی چھپی باتیں اس طرح کر جاتے ہیں کہ اوٹ میں موجود حسن کا تصوّراتی لطف بڑھ جاتا ہے۔ اس کے عقب میں جو کچھ ہے، دلچسپ ہو جاتا ہے۔ اس کے باوجود شاہد اختر کو پڑھتے ہوئے کبھی کبھی یہ خدشہ لاحق ہو جاتا ہے کہ کہیں وہ Eroticism کے چکّر میں نہ آجائیں، جس سے وہ ابھی تک بال بال بچ گئے ہیں۔ انّا دُکا جگہوں پر وہ جملوں میں شعریت پیدا کرنے کی رَو میں آگئے ہیں۔

❁❁❁

حساب

گھر میں ایک عدد خادمہ کی ضرورت تھی۔ جس کی تلاش کئی دنوں سے جاری تھی۔ دراصل خادماؤں کا معاملہ بھی اب اتنا آسان نہیں رہا جیسے کہ پہلے ہوا کرتا تھا۔ جب انہیں اپنی اہمیت کا اندازہ ہوا تو ناز و نخروں میں اضافہ تو یقینی تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ ہم پہلی بار کسی کام کرنے والی کی تلاش میں تھے۔ اس سے پہلے بھی کئی آئیں اور گئیں۔ کچھ سے ہم مطمئن نہیں ہوئے تو کچھ ہم سے۔

اب سے پہلے جو عورت کام کر رہی تھی، اسے چوری کی عادت بھی تھی۔ چند دنوں میں سب عیب و ہنر واضح ہو جاتے ہیں۔ ہم لوگ اس کی کرتوتوں سے واقف ہو گئے۔ ساتھ میں کچھ محتاط بھی۔ اسے تو بہر حال ہٹانا ہی تھا۔ یہ بھی تھا کہ اُسے جواب دینے سے پہلے کسی دوسری کا بندوبست ہو جائے تو زیادہ بہتر ہے۔ حد تو تب ہو گئی جب ایک روز بیگم کی ایک انگوٹھی غائب ہو گئی۔ اب کیا کیا جائے؟ ایک صورت تو یہ تھی کہ اسے کمرے میں بند کر کے زدوکوب کیا جائے مگر اس کے لیے ہم خود کو ذہنی طور پر آمادہ نہیں کر پائے۔ یہ ہمارے مزاج کا حصہ نہیں تھا۔ دوسرا راستہ یہ تھا کہ ہم پولیس کی مدد لیں۔ اس سوال کے ساتھ پولیس کی

نفسیات کے تعلق سے کئی اور پیچیدہ سوال سامنے آ کھڑے ہوئے۔آخر میں متفقہ طور پر یہ طے ہوا کہ ہم کسی کے پاس نہیں جائیں گے اور اسے ڈانٹ ڈپٹ کر بھگا دیتے ہیں اور ہم نے یہی کیا.......۔

اگلے روز سے گھر کے کام کا مسئلہ سامنے آنا تھا اور وہ آ بھی گیا۔گو کہ بیگم کو گھر کے کام کاج سے کوئی وحشت نہیں تھی۔بس اب عمر کے ساتھ جسم کی بڑھتی ہوئی کمزوریاں اس کی حوصلہ شکنی کر رہی تھیں۔وہ امور خانہ داری کے بیشتر شعبوں میں نہ یہ کہ بہت طاق تھی بلکہ اسے لطف آتا تھا مگر اب ہر طرح کے آرام و آسائش کے سبب الگ الگ نام سے کئی طرح کی بیماریاں آ لگی تھیں اور اکثر لوگ اس عتاب کی زد میں تھے۔

جھاڑو، پونچھا، برتن، کپڑوں کی دھلائی، سل پر مصالحے کی پسائی جو کبھی اچھی صحت اور فٹ رہنے کی علامت ہوا کرتے، اب منفی اثر ڈال رہے تھے۔آیا کے بغیر ایک بھی دن کام کرنا پڑے تو کلیجہ منھ کو آتا ہے۔ہر چند کہ صاحب خانہ کا اس معاملے سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہوتا لیکن پھر بھی گھر کے اچھے بھلے ماحول پر اس کے منفی اثرات تو بہر حال پڑتے ہیں۔بیوی کے ساتھ کہیں نہ کہیں میں بھی ذہنی شکست و ریخت کا شکار تھا۔یہی وجہ تھی کہ میں نے بھی اپنے ملنے جلنے والوں سے ایک عدد خادمہ کے انتظام کی درخواست کی تھی۔بہر حال پانچویں دن یہ خوش آئند خبر سنائی کہ ''بندوبست...... ہوگیا....... ہے۔کل سے آئے گی۔'' جیسا کہ مرد کی نفسیات ہوتی ہے کہ وہ سب سے پہلے اس کی عمر سے واقف ہو۔شادی شدہ ہے یا غیر شادی شدہ۔نقش و نگار اور نشیب و فراز سے بھی جتنی جلد ممکن ہو معلومات حاصل ہو جائے۔یہ سوالات کم سے کم بیوی سے پوچھنے کی جسارت تو شاید ہی کوئی کرتا ہو۔مجھے بھی کل تک کا انتظار کرنا تھا۔بہت غور و خوض کے بعد زبان سے اتنا ہی نکلا۔''مسلمان . . . . . . ہے . . . . ؟'' ہاں . . . . . . عائشہ . . . . . . نام

...... ہے...... سپاٹ سا جواب ملا۔میں نے اس کے نام کو زیر لب دہرایا. . . . . . عا...... ئشہ۔اس نام کے تقدس اور تکریم میں ذہن کی غلاظت صاف ہوگئی اور پاکیزہ جذبوں کے ساتھ زبان پر حلاوت کا ذائقہ سا محسوس ہوا۔یہ عجیب سا محسوس ہوا۔یہ عجیب طرح کا تجربہ تھا۔میں خود بھی حیران تھا۔عائشہ کے پیکر میں جیسے نور کا ہالا میرے اطراف قائم ہوگیا تھا۔میں اپنے ذہن کو منتشر کرنا چاہتا تھا۔اٹھ کر میں گملوں میں لگے پیڑ پودوں کی طرف متوجہ ہوگیا۔خشک پتیاں توڑ کر الگ کرنے لگا۔دیر تک خوش رنگ پھولوں کو دیکھتا اور محظوظ ہوتا رہا۔

اگلی صبح دفتر جانے سے قبل ایک خاتون گھر میں داخل ہوئی۔ڈری سہمی ہوئی دھان پان سا بدن، گندمی رنگت، عمر تقریباً تیس برس رہی ہوگی۔مبادا کہیں یہ عائشہ تو. . . . . . نہیں...... ؟ ذہن میں فوراً یہ سوال ابھرا۔''آ گئیں۔'' بیگم کے انداز تخاطب سے تصدیق بھی ہوگئی۔''ہاں...... باجی...... ''۔غربت اور محرومی میں لپٹی۔اس کی آواز بھی سنائی دے گئی۔کل سے اَب تک اس کے بارے میں ذہن نے جو بھی قیاس آرائیاں کی تھیں وہ بالکل ان کے برعکس تھی۔میں خوش نہیں تھا مگر میں افسردہ بھی نہیں تھا۔چوری چھپے غیر عورتوں کے خد و خال ٹٹولنے کی عیاری سے کون مرد بچتا ہے مجھے نہیں معلوم...... ؟ مگر میں اس میں شامل تھا۔وہ اگر گدرائے بدن کی کوئی آفت کی پرکالا ہوتی تو دیکھنے میں زیادہ ہی لطف آتا۔بہت ممکن ہے کسی وقت جھاڑو، پوچھا لگاتے وقت اس کا دوپٹہ ڈھلک جائے اور میں اچانک اس کو سنبھلنے کا موقع دیے بغیر اس کے سامنے آ کر گریبان میں سے جھانکتے یا باہر کو اگلے پڑ رہے پستانوں کو دیکھ کر دم بخود جاؤں۔گھر میں کام کرنے والی اکثر شریف زادی ہے تو اس سے زیادہ کی توقع کم سے کم میرے جیسا آدمی تو نہیں کرتا۔معاملہ اگر اس کے برعکس ہے یعنی عورت میں تھوڑا اچھنال پن ہے تو لطف لینے کی مدت اور کم ہو جاتی ہے کیوں

کہ فاحشہ کسی شریف کے یہاں تب ہی تک ٹھہر سکتی ہے جب تک اس کی حقیقت واضح نہ ہو .....اور یہ حقیقت..... کہاں..... کب تک..... پوشیدہ رہتی ہے بھلا۔

مرد خواہ کتنا ہی مشاق و تجربہ کار ہو، نگاہ کے معنی اور لمس کے مفاہیم عورت سے بہتر نہیں سمجھ پاتا..... میرے تو سارے منصوبے دھرے رہ گئے۔ پوری بازی ہی پلٹ گئی تھی۔ وہ تو وقت اور حالات کی ماری ایک دکھیاری عورت دکھ رہی تھی۔ اگر وہ یہاں پابندی سے کام کرتی رہی تو کچھ عرصہ بعد اس کی حکایت بھی معلوم ہو جائے گی۔ حالاں کہ مزید کچھ جاننے کی نہ خواہش بچی تھی اور نہ ہی دلچسپی۔ اتنی سی دیر میں میں نے محسوس کیا تھا کہ اس کی اداس آنکھیں بہت کچھ بیان کر رہی تھیں۔ جسم کے دوسرے اعضا بھی اس کام میں اس کی مدد کر رہے تھے۔

بیگم نے سب سے پہلے رسمی تعارف حاصل کیا اور پھر گھر کا معائنہ کروایا۔ ساتھ میں کچھ ہدایتیں بھی جاری کیں۔ حکم حاکم مرگ مفاجات۔ وہ خاموشی سے سنتی رہی اور ''جی باجی'' کا مختصر سا جواب دیتی رہی۔

عائشہ کے تعلق سے کچھ باتیں چند روز بعد میرے بھی گوش گزار ہوئیں۔ مثلاً وہ پانچ بچوں کی ماں ہے۔ پندرہ برس کی عمر میں اس کی شادی کر دی گئی اور شادی کے آٹھ ماہ بعد ہی پہلے بچے کی ولادت ہوگئی۔ باقی کے چار بچوں میں بھی سال بھر سے زیادہ کا فرق کسی میں بھی نہیں ہے۔ شوہر دن میں رکشہ کھینچتا تھا اور رات میں جو روکو۔ شراب وغیرہ کی عادت بھی تھی اسے۔ عائشہ کا صبر اب ٹوٹ رہا تھا۔ اس کی قوت برداشت جواب دے رہی تھی۔ نشے کا عادی ہو کر اس طبقے میں عورت پر ہاتھ نہ اٹھائے تو یہ صرف اس کی شان کے ہی خلاف نہیں اس کی مردانگی پر بھی سوال قائم کرتا ہے اور یہیں سے عائشہ کا حوصلہ ٹوٹنا شروع ہوا۔ عورت سسرال میں تمام جبر اور صعوبتیں برداشت کر سکتی ہے، اگر اسے شوہر کی حمایت

حاصل ہو لیکن اگر ظلم کرنے والا اس کا خاوند ہی ہو تو پھر اس کے گھر کے در و بام سے اس کی وابستگی کم ہونے لگتی ہے اور چوکھٹ سے من اچاٹ ہو جاتا ہے۔

دفاع کے سارے اقدامات اٹھانے کے بعد بھی جب وہ ناکام رہی تو ایک روز جھولا اور بچوں کو سمیٹ کر دہلیز پھلانگ آئی۔

اپنی ضروریات کے لیے اسے کوئی کام بھی تلاش کرنا تھا مگر گھروں میں جھاڑو و برتن کے علاوہ وہ اور کر بھی کیا سکتی تھی۔ آخر کار اس نے کام شروع کر دیا اور جلد ہی اس نے کئی گھر پکڑ لیے جس سے وہ اپنے بچوں کی بھوک مٹا سکے۔

دھیرے دھیرے اس کے مزاج اور رویوں سے واقفیت ہوتی گئی اور پھر ذہنی قربت بھی۔ وہ جتنی دیر میرے سامنے رہتی میں اسی کے بارے میں سوچتا رہتا۔ اس کے چلے جانے کے بعد بھی خود کو اس کے خیالوں سے آزاد نہیں کر پاتا۔ زندگی کسی کے لیے اتنی سفاک اور سخت بھی ہو سکتی ہے؟ میں ششدر تھا۔ اس کے نزدیک زندگی کے کیا معنی ہوں گے؟ بہت سوچنے کے بعد بھی میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پاتا۔

میرے یہاں کام کرتے ہوئے اسے تقریباً ایک ماہ کا عرصہ ہو رہا تھا۔ اچانک ایک دن انکشاف ہوا کہ وہ بلا کی خوددار بھی ہے۔ اس دن جب وہ گھر میں داخل ہوئی تو کچھ بجھی بجھی سی تھی۔ ویسے بھی اس کے چہرے پر ایک دائمی اداسی کے سوا میں نے دیکھا بھی کیا تھا۔ میں شاید معاملہ کی تہہ تک پہنچ بھی نہ پاتا۔ بیگم کو کچھ شبہ ہوا تھا۔ اس کی تصدیق کے لیے انہوں نے عائشہ سے دریافت کیا۔ وہ بڑی صفائی سے بات کو ٹال گئی مگر دوپٹے کے کونے سے آنکھ میں کچھ صاف نہ کیا ہوتا تو شاید بیگم یقین بھی آ جاتا۔ اس کے بعد انہوں نے اُسے کریدنا شروع کیا۔ قدرے توقف کے بعد اس کا صبر جواب دے گیا۔ ''باجی..... بچے کل سے بھوکے ہیں'' کہتے کہتے وہ سسک پڑی۔ بیوی کی آنکھیں حیرت سے پھٹی ہوئی تھیں

www.urduchannel.in

۔میں بھی اخبار ایک طرف رکھ کر بہت انہماک سے ادھر متوجہ ہو گیا تھا۔

''بچے کل سے بھوکے ہیں پھر بھی تیری زبان سے کچھ نہیں پھوٹا۔'' بیوی نے اسے ڈانٹنے کے انداز میں کہا۔اسی ڈانٹ میں پوشیدہ خلوص کو بھی وہ محسوس کر سکتی تھی۔بیگم پھر سے گویا ہوئیں۔''مجھے کیوں..... گناہ گار بنا رہی ہے لڑکی..... کل قیامت کے روز ..... کیا اللہ..... مجھ سے اس کا حساب نہیں مانگے گا؟ جا..... جھاڑو اپنے ٹھکانے پر رکھ.... میں کھانا دیتی ہوں..... پہلے جا کر بچوں کو کھانا کھلا اور خود بھی کھا لینا..... اس کے بعد ہمت ہو تو آ جانا ورنہ کوئی بات نہیں۔بیگم بولنے کے ساتھ کھانا بھی نکالتی جا رہی تھیں۔ ٹفن ہاتھ میں لینے کے بعد عائشہ کے چہرے پر خوشی اور اطمینان کی ایسی چمک دیکھی تھی، وہ اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی۔ایک وقت کا کھانا اب بھی اس دنیا میں لوگوں کے لیے اس قدر مشکل ہو سکتا ہے۔''خبر دار ..... آئندہ پھر انہیں بھوکا سلایا تو..... اور ..... ٹھہر ..... ذرا..... یہ کچھ پیسے بھی لیتی جا.....۔'' بیوی نے ایک بار پھر تنبیہ کی۔عائشہ تیز تیز قدموں سے باہر نکل گئی۔میں بیگم کی کہی ہوئی باتوں کے بارے میں از سر نو غور کرنے لگا۔در اصل ایک جملہ اسی وقت ذہن سے چپک گیا تھا۔کل قیامت کے دن ..... کیا..... حساب..... دوں گی۔حساب تو مجھے بھی دینا ہے۔اس نقطۂ نظر سے اپنی ذات کا محاسبہ اپنے آپ شروع ہو گیا۔اوروں کی نظر میں تو بڑا نیک اور پارسا بنا پھرتا ہوں مگر اللہ کے حضور حساب دینے کے خیال سے ہی تھرتھری چھوٹ جاتی ہے۔صمیم دل سے زیر لب دعا کرتا ہوں۔وہ بخش دے گا۔بخش ہی دے گا۔وہ غفور الرحیم ہے۔میں اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ بیوی کی آواز پھر سے کانوں میں پڑی۔''کیا..... دفتر..... نہیں..... جانا..... ہے''

۔''ہاں..... کیوں..... نہیں جانا ہے۔'' کہتے ہوئے میں بڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

اب انسان کی شناخت اتنی آسان نہیں جتنی پچھلے وقتوں میں ہوا کرتی تھی پھر بھی

کسی نہ کسی پر اعتبار مجروح ہونے سے بچ جاتا ہے۔اب یہ الگ بات ہے کہ سرخ رو ہونے کے مواقع عائشہ جیسی مجبور و لاچار ذی روح سے عبارت ہیں۔میں نے غور کیا تھا کہ ادھر عائشہ کے بارے میں کچھ زیادہ ہی سوچنے لگا تھا۔اس کے خیالات کے ساتھ ہمدردی کے جذبے بھی ساتھ آتے۔جیسے جیسے اس کی خوبیوں کا انکشاف ہوتا جا رہا تھا، میری نظر میں اس کی قدر و قیمت بھی بڑھتی جا رہی تھی۔اتنی تنگی اور سخت حالات کے باوجود وہ بہت ایماندار واقع ہوئی تھی۔آج کے وقت میں یہ کوئی معمولی خوبی نہیں تھی۔

ایک دن بیوی نے ڈریسنگ ٹیبل کے پیچھے سو روپے کا نوٹ موڑ کر ڈال دیا تھا۔ جھاڑو لگانے کے بعد وہ نوٹ ہاتھ میں لیے بیگم کے سامنے کھڑی تھی..... ''باجی..... یہ ..... سنگھار میج (میز) کے پاس پڑا تھا۔وہ امتحان میں پاس ہو گئی تھی لیکن ہم یہیں پر مطمئن نہیں ہوئے۔زیورات پر بھی یہ تجربہ کیا اور اپنی ناکامی پر بہت خوش ہوئے۔وہ بہت صبر والی بھی تھی۔میں اس سے بہت کچھ سیکھنا چاہتا تھا۔کسی طرح اور کتنا..... کب ..... سیکھ پاؤں گا۔یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا۔

بیگم اور عائشہ دونوں ہی کسی حد تک ایک دوسرے کے مزاج سے واقف ہو گئی تھیں اور ایک دوسرے کی ضرورتوں کا احترام بھی کر رہی تھیں۔کام کاج کے بارے میں خاتون خانہ کے کیا مطالبے ہیں؟ یہ عائشہ کو معلوم تھا اور وہ بھی کسی حد تک اپنی ملازمہ کو مطمئن کیے ہوئے تھیں بلکہ عائشہ نے کئی بار خود ہی انہیں بتایا کہ ''باجی ہم جتنے بھی گھر میں کام کرتے ہیں، آپ کا مجاج (مزاج) بالکل الگ ہے۔وہ اس طرح کا اظہار نہ کرتی تب بھی مجھے معلوم تھا کہ میری بیوی اس کی چھوٹی موٹی ضروریات کا خیال رکھتی ہے۔کپڑے وغیرہ بھی دیتی رہتی۔رات کا بچا ہوا کھانا تو اب اس کے لیے مختص تھا۔ایسا نہیں تھا کہ ہمارے یہاں وہ کھایا نہیں جاتا۔بس اسے عائشہ کا وہ جملہ نہیں بھولتا اور ساتھ میں عائشہ کی روتی ہوئی صورت

www.urduchannel.in

بھی۔

عائشہ کی ایمانداری اور ہر کس و ناکس کے سامنے اپنا دکھڑا نہ رونے کی عادت بیگم کو کچھ زیادہ ہی پسند آئی تھی۔ شاید یہی وجہ ہو کہ وہ عائشہ کا بطور خاص کچھ زیادہ ہی خیال رکھتی تھیں۔ ساتھ میں یہ خواہش بھی تھی کہ وہ اب کبھی یہ گھر چھوڑ کر نہ جائے۔ کام کرنے والیاں تو بہت مل جائیں گی مگر..... عائشہ..... جیسی.....؟ وہ بھی ہمارے گھر کے ماحول سے خاصا مانوس ہوگئی تھی۔ اپنے راز و نیاز میری بیوی سے شیئر کرنے لگی تھی مگر اس کے راز و نیاز بھی کیا؟

میں محسوس کر رہا تھا کہ بیگم کو بھی عائشہ کے متعلق زیادہ معلومات حاصل کرنے میں خاصی دلچسپی تھی۔ روز ہی کچھ نئی باتیں معلوم ہو رہی تھیں۔ عام طور سے کام کرنے والیاں ہر گھر میں دوسرے گھر کا کچا چٹھا کھول دیتی ہیں مگر وہ اس عیب سے بھی پاک تھی۔ بیوی نے کبھی اشاروں کنایوں میں ادھر ادھر کا جائزہ لینے کی کوشش کی بھی تو وہ بات گول مول کر گئی۔ مجھے حیرت اس بات پر ہوتی کہ ایسی گفتگو کے لیے یہ ہوشیاری اور سلیقہ کہاں سے سیکھا ہے جو دوسرے معاملات میں بہ آسانی سطح سے اوپر آجاتا ہے۔ وہ غیبت سے حتی الامکان گریز کرتی۔ اس کی باتیں زیادہ تر اس کے ماضی سے متعلق ہوتیں یا اپنے گھر اور بچوں کے بارے میں۔ وہ ان کی تربیت اور ان کے مستقبل کے لیے بہت فکرمند تھی۔ وہ اپنی تنگ دستی یا محرومی کا رونا کبھی ہمارے سامنے نہیں روتی۔ اس کی کسی بات سے کبھی یہ نہیں لگا کہ اسے ہم سے تنخواہ کے علاوہ بھی پیسوں کی ضرورت ہے۔ بیگم جو کچھ اپنی مرضی سے دے دیتیں وہ رکھ لیتی۔ ہاں کبھی شدت سے انکار نہیں کرتی ..... ''ارے .....باجی .....اس کی کیا ضرورت ہے۔ آپ تو ویسے ہی میرے ساتھ اتنا کرتی ہیں.....'' اس طرح کے جملے البتہ وہ ضرور ادا کرتی۔

اس کے آنے اور میرے ناشتے کا وقت تقریباً ایک ہی تھا۔ اسے سخت تاکید کی گئی تھی کہ آنے کے بعد سب سے پہلے وہ اپنے لیے چائے بنائے گی۔ اس کے بعد ہی کام شروع ہوگا۔ اسی وقت ان کی کچھ باتیں میں براہ راست سن لیتا اور کچھ باتیں جن میں کوئی خاص بات ہوتی تو وہ مجھے بعد میں بیوی سے معلوم ہو جاتی۔ میں اب جان بوجھ کر ناشتہ میں زیادہ تاخیر کرنے لگا تھا۔

عائشہ نے مجھے کس طرح لیا تھا یہ مجھے نہیں معلوم۔ میرے ہونے نہ ہونے سے اس پر کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ شاید اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ اس کے ظاہر و باطن میں کچھ تضاد نہ تھا۔ میں یہ دکھانے کی کوشش بھی کرتا کہ جیسے مجھے ان باتوں میں کوئی دلچسپی نہیں ہے اور نہ ہی میں سن رہا ہوں۔

گھر سے نکلنے سے لے کر واپسی تک وہ تقریباً ساڑھے تین کلومیٹر کی مسافت پیدل طے کرتی ہے۔ وقت کی پابندی کے ساتھ بغیر کسی عذر کے ناغہ بھی نہیں کرتی۔ عذر بھی چھوٹے موٹے نہیں ہوتے۔ میں عائشہ کے بارے میں کچھ زیادہ ہی سوچنے لگا تھا۔ ٹھیک ہے وہ کچھ خوبیوں کی مالک ہے مگر ہے تو میری ملازمہ۔ ہمزاد مجھ سے سوال کرتا ہے۔ میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ عائشہ کے خیال سے خود کو بچائے رکھوں، یہ میرے اختیار سے باہر ہے۔ میں صبح سے ہی اس کا انتظار کرنے لگا۔ بار بار گھڑی کی طرف نظر اٹھتی۔ میری ذہنی کیفیت کا اندازہ کسی کو نہیں تھا۔ میرا یہ انتظار کسی محبوبہ کے لیے نہیں تھا۔ دراصل یہ معاملہ ہی اور طرح کا تھا۔ میں اس موضوع پر کسی سے گفتگو بھی نہیں کر سکتا تھا۔ سب جانتے ہیں کہ وہ میرے یہاں کام کرنے والی ایک ادنیٰ اور مفلوک الحال عورت ہے۔ میری اس سے کسی سطح پر ذہنی ہم آہنگی ممکن نہیں ہے۔ میرے ہر حکم پر دوڑنے والی۔ مجھ سے عقیدت و احترام رکھنے والی۔ یہاں تو معاملہ اس کے برعکس تھا اور شاید اس بار ہمزاد سے چوک ہوگئی..... یہ عقیدہ

اسے بھی نہیں معلوم اور بھلا میں کیوں بتاؤں کہ میں اس کا احترام کرنے لگا ہوں۔ چار کتابیں پڑھ کر خود پر اترانے اور دوسروں کو مرعوب کرنے کی کوشش کرنے والا..... میں..... اس عائشہ سے ہار گیا۔ جن اعلیٰ اخلاقی اقدار پر بحث ومباحثہ کرتا، پیپر لکھتا، تقریر ہی کرتا۔ وہ مجھے عمل کر کے دکھا رہی تھی۔

ایک دن وہ بغیر کسی اطلاع کے غائب ہو گئی۔ ہم لوگ ..... ہکا ..... بکا ..... تشویش تو ہونی ہی تھی۔ رابطہ کے لیے اس نے اپنے بھائی کا نمبر دیا تھا جو مسلسل سوئچ آف بتا رہا تھا۔ وہ اور جن گھروں میں کام کرتی تھی وہاں بھی رجوع کیا تو وہ الٹا ہی باز پرس کرنے لگے۔ جب کہیں سے اطمینان بخش جواب نہیں ملا تو انتظار کے علاوہ اور ہو بھی کیا سکتا تھا۔

اگلے روز وہ اپنے مقررہ وقت پر آ گئی۔ سب سے پہلے کل نہ آنے کی وجہ دریافت کی گئی۔ بیگم کے لہجے میں نہ بتانے کے سبب کچھ برہمی بھی تھی۔ عائشہ بھانپ گئی تھی۔ نظریں نیچی کیے وہ بولی۔ ''باجی ..... اماں کی طبیعت بہت کھراب (خراب) ہو گئی تھی۔ انہیں ڈاکٹر کے یہاں لے جانا پڑا''۔ تم نے تو بتایا تھا کہ تمہاری ماں کا انتقال ہو چکا ہے؟ بیگم نے قدرے حیرت کا اظہار کیا۔ ''باجی یہ ہماری دوسری اماں ہیں''۔ ''دوسری..... ماں .....؟'' میں بھی بد بدایا تھا۔ وہ آگے بولی ''ہمارے ابا نے ہماری کھالا (خالہ) سے نکاح کیا تھا۔ ہماری اماں کے ہمارے ابا سے پانچ لڑکیاں ہوئیں۔ ابا کو لونڈے کا بڑا ارمان تھا کھالا (خالہ) کے میاں کھتم (ختم) ہو گئے اور پھر ایک دن پتہ چلا کہ صبح کھالا کا ابا کے سنگ نکاح ہے۔ اماں نے بھی کوئی اعتراج (اعتراض) نہیں کیا۔ دونوں سگی بہنیں تھیں اور رہیں بھی سگی بہنوں کی طرح۔ کھالا سے ابا کے چھ بچے ہوئے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ کچھ مسکرائی۔ بیوی نے مسکرانے کی وجہ پوچھی۔ ''ابا اندھے ہیں..... وہ کچھ دیکھ

نہیں سکتے۔'' یہ جملہ پورا ہوتے ہی بیوی زور سے ہنسی۔ مسکراہٹ تو میں بھی نہیں روک پایا تھا۔ بڑے شاطر نشانے باز ہیں..... تمہارے ..... ابا..... آنکھوں کے بغیر بھی کوئی نشانہ خطا نہیں ہوا'' یہ واقعہ کئی دنوں تک ہم نے مزے لے لے کر دوسروں کو سنایا۔

عائشہ اب ہم لوگوں سے کسی حد تک مانوس اور بے تکلف ہو گئی تھی۔ وہ اپنے مسائل تو بیان کرتی مگر دست طلب ہمارے سامنے نہیں پھیلاتی۔ زیادہ تر بچوں کی باتیں کرتی۔ بڑا لڑکا پندرہ کا ہو رہا تھا۔ وہ تو صبح سے ہی گھر سے نکل آتی ہے۔ بچوں کا دھیان بھی کون رکھے۔ وہ سارا دن اواہی تواہی کھومتے رہتے۔ بڑا والا تو اپنے سے خاصے بڑے لڑکوں کی سنگت میں پڑ گیا تھا۔ نشہ کا چسکا لگ گیا تھا۔ وہ سب سے زیادہ اس کی طرف سے فکرمند تھی۔ وہ اسے کسی کام دھندے سے لگانا چاہتی تھی۔ کچھ عرصہ بعد ایک ہنر ہاتھ آ جائے گا اور اوباشوں کی صحبت سے بھی نجات مل جائے گی۔ میرے پاس بھی اس نے یہ عرضی ڈالی تھی۔ میں غور کر رہا تھا کہ کون سا کام اس کے لیے مناسب ہوگا۔

اگلے روز اطلاع آئی کہ اس کا شوہر نہیں رہا۔ وہ ابھی کچھ دن کام پر نہیں آئے گی۔ بیوی کو شبہ ہوا کہ کہیں عدت پوری کر کے تو نہیں آئے گی۔ اس کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔ سوائے انتظار کے ہم کر بھی کیا سکتے تھے۔ بہرحال وہ تیسرے دن واپس آ گئی۔ آنکھیں اور اندر کو دھنس گئی تھیں وہ اور زیادہ کمزور لگ رہی تھی۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے اس کے رونے کی کہانی بیان کر رہے تھے۔ یہاں بھی روداد بیان کرتے وقت آنکھیں اور آواز کئی بار نم ہوئیں..... ''باجی وہ اسمیک کالتی بھی تھا اور اس کی وجہ سے مر گیا۔''

''عدت میں..... نہیں بیٹھو گی.....؟ بیوی نے کچھ تکلف کے ساتھ پوچھا۔

''ہم بیٹھ گئے تو بچوں کا کھانا کون کھلائے گا.....؟'' آس پاس ایک عجیب سوگواری کا سا ماحول طاری تھا۔

www.urduchannel.in

اس کے بعد وہ کافی دنوں تک بجھی بجھی سی رہی۔شوہر کی موت کا اس پر گہرا اثر تھا ۔بیوی کو چاہے وہ پیر کی جوتی سمجھتا ہو..... کتنے ہی ظلم کرے مگر پھر بھی وہ جانے کیا چیز تھی جو اُس زہر کا تریاق بننا چاہتی تھی۔

ایک دن وہ آئی تو کچھ افسردہ سی تھی۔ یہ اضمحلال خاوند کی موت کے غم سے مختلف تھا۔بیگم بھی اس کے تاثرات خوب سمجھنے لگی تھیں۔ عائشہ کو ٹٹولنا شروع کیا تو وہ شروع ہوگئی ۔''باجی..... یہ..... فرزانہ بھابھی کا حساب میری سمجھ میں نہیں آتا۔ہم پڑھے لکھے تو ہیں نہیں کہ سارا حساب ڈائری میں لکھیں۔ جہاں تک پیسوں کی بات ہے تو ہمیں یہ یاد رہتا ہے کہ کب کس نے کتنے پیسے دیے۔ہم نے ان سے پنکھے کے لیے پانچ سو روپے ایڈوانس لیے تھے۔سو روپے مہینے کے حساب سے وہ ہر مہینے تنخواہ سے کاٹ رہی تھیں۔پچھلے مہینے کٹوتی پوری ہوگئی لیکن اس بار پھر کاٹ لیے.....۔باجی! ان کے لیے سو روپے کی کیا اہمیت ہے مگر میرے لیے ..... تو..... سو روپے میرے بچوں کا ایک ہفتہ کا کھانا ہے۔ مجھے حساب کتاب نہیں آتا مگر اس بار فرزانہ بھابھی کے حساب نے بہت پیڑا دی ہے ہمیں۔''

''تم .....پریشان مت ہو ..... سو.....روپے کی بات ہے ۔مجھ سے لے.....لینا.....۔'' بیوی کی یہ تجویز اسے پسند آئی تھی کیوں کہ پھر وہ مطمئن ہوگئی۔ایک ہفتہ بعد رمضان شروع ہوگئے۔ پہلا روزہ تھا۔ وہ آئی تو معلوم ہوا کہ روزے سے ہے۔ کیسے رکھ پائے گی روزہ.....اتنے گھروں میں کام کرتی ہے.....اوپر سے اتنی سخت گرمی۔اے سی کولر میں تو چین نہیں پڑ رہا.....۔'' بیوی اسی سے مخاطب تھیں۔

''باجی ..... ہم لوگوں کو روجہ (روزہ) اور بنا روجہ کا فرق اتنا نہیں پتہ چلتا۔کم سے کم گناہ تو نہیں پڑے گا۔''

''روجہ ..... نہیں، روزہ ہوتا ہے ۔میں پہلے بھی تمہیں کئی بار ٹوک چکی

ہوں۔کسی مسلمان کے منہ سے زیادہ خراب لگتا ہے۔اندازہ تو مجھے شروع میں ہی ہو گیا تھا کہ تمہارے نقطے گرے ہوئے ہیں لیکن میں مناسب وقت کا انتظار کر رہی تھی۔''

''باجی.....اب.....ہم نقطے اٹھائیں کہ پانچ بچوں کی بھوک پیاس کی جمے داری.....۔'' وہ کچھ زیادہ ہی اداس ہوگئی.....۔

''خیر..... چھوڑو.....یہ.....باتیں.....۔تم ابھی کیا کہہ رہی تھیں کہ روزہ رکھ لینے سے گناہ نہیں پڑے گا''۔''ہاں.....تو..... گلت (غلط) کہہ رہے تھے کیا؟ اس کی سادگی اور بھول پن گرویدہ کرتا ہے۔

''تمہیں .....اللہ .....میاں .....سے کوئی شکایت ..... نہیں.....؟ بیوی کچھ کریدنا چاہتی تھی''۔باجی.....ہماری ایک چچی ہیں.....بہت امیر ہیں.....پتہ نہیں انہیں ..... کون سی بیماری ہے ۔بستر سے اٹھ بھی نہیں پاتیں۔ان کے علاج پر لاکھوں.....روپے کھرچ (خرچ) ہوا مگر کوئی فائدہ نہیں.....نہ کچھ کھا سکتی ہیں نہ پی سکتی ہیں۔نلکی سے پینے والی چیز ہی دی جاتی ہیں۔بس سانسیں ہیں تو لگتا ہے اللہ پاک نے ہم کو بہت کچھ دیا ہے۔وہ خاموش ہوئی مگر میں اندر تک لرز گیا تھا۔ میں عائشہ کو شاید اب بھی پوری طرح نہیں سمجھ پایا تھا۔میری تجربہ کار آنکھیں دھوکہ نہیں کھا سکتیں۔وہ کوئی اداکاری نہیں کر رہی تھی۔اس کے ظاہر و باطن میں کوئی خاص فرق نہیں تھا۔ یہ بات میں کئی بار نوٹ کر چکا تھا بلکہ میرے پاس اس کے ثبوت بھی تھے۔

''تم نے کبھی سوچا ہے کہ اللہ رب العزت تم سے کس چیز کا حساب لے گا؟'' بیوی نے ایک اور سوال کیا۔ میں بظاہر اخبار پڑھ رہا تھا مگر میری پوری توجہ ان کی گفتگو پر مرکوز تھی ۔اس کے چہرے سے لگ رہا تھا جیسے بیگم کی بات غالباً پوری طرح اس کی سمجھ میں نہیں آئی ہے۔

www.urduchannel.in

''باجی..... آپ کو..... تو..... میرے حساب کتاب کے بارے میں پتہ ہے کہ بہت کچا ہے۔ بچے تک میرا مجاک (مذاق) اڑاتے ہیں مگر میری یاد داست (یاد داشت) بہت اچھی ہے۔ کسی نے مجھے کب..... کیا..... دیا..... یہ سب کچھ مجھے اچھی طرح یاد ہے..... بچپن کی چھوٹی چھوٹی باتیں..... تک..... باجی۔ اب چلیں۔ دیر ہو گئی..... باجی..... شام کو لڑکے کو بھیج دیں گے تو برف دے دیجئے گا۔'' عائشہ کے جملوں کی بازگشت میرے اندر مدوجزر برپا کیے تھی۔

میری اپنی تمام برف پانی ہو چکی تھی..... میں عائشہ کو جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ ایک بات ذہن میں بجلی کی طرح چمک رہی تھی..... کیا..... واقعی ..... عائشہ ..... اپنے حساب میں اتنی کمزور ہے.....؟ وہ میری نظروں سے دور اور دور ہوتے ہوئے معدوم ہو گئی.....!

(ماہنامہ ''آجکل، نئی دہلی۔ دسمبر 2014ء)

❁❁❁

کتا

دسمبر کے آخری دن چل رہے تھے۔ ختم ہوتے ہوئے سال کے ایک نئے دن کا آغاز ہوا چاہتا تھا۔ سخت سردی کا موسم تھا۔ بوڑھے کیا جوان بھی اسی پالا مارتی سردی سے عاجز ہو گئے تھے۔ ڈی ایم نے درجہ آٹھ تک کے اسکول غیر معینہ مدت کے لیے بند کرنے کا حکم نامہ جاری کر دیا تھا۔

کہرے اور اوس میں بھیگی فضا..... ٹمٹماتی یرقان زدہ پیلی روشنیاں، عجیب سی سوگواری کا سا ماحول گہرے سکوت کو توڑتی ہوئی مسجدوں سے فجر کی اذانیں بلند ہوئیں۔ اللہ اکبر کی صدا کے ساتھ ہی ان کی آنکھیں کھل گئیں۔ چند ساعتوں کا توقف..... ہوش وحواس بحال ہوئے۔ ''بیشک نماز نیند سے بہتر ہے۔'' کہتے ہوئے اسلام حیدر نے بستر چھوڑ دیا۔ سب سے پہلے ''گیزر آن کیا، پھر حوائج ضروری میں مصروف ہو گئے۔ کچھ ہی دیر میں وضو کے لیے گرم پانی دستیاب ہو گیا۔ اب تک ان کی بیگم بھی اُٹھ کر باورچی خانے میں چائے چڑھانے کے لیے جا چکی تھی..... ''حاجی..... جی..... انڈے..... اُبال دوں''۔ ''ہاں مگر نماز کے بعد ہی کھاؤں گا..... جماعت تیار ہے..... چلتا ہوں، کواڑ بند کر لو۔''

www.urduchannel.in

عمر میں یہ خطرناک والے انجکشن لگوانا ہی رہ گیا تھا۔''

''آپ بیٹھئے..... میں پہلے Detol سے صاف کردوں.....۔''

''بیگم ..... گیزر آن کر دو..... نجس بھی تو ہو گیا ہوں..... غسل کرنا ہے۔'' رقیہ شیشی لے کر آئیں اور زخم کی صفائی کرنے لگیں۔

''ہوا..... کیا تھا..... حاجی.....جی.....؟ آپ تو روز کے جانے والے ہیں''۔''اتنے برسوں کا اعتماد اور بھرم ذرا دیر میں ختم ہو گیا۔'' اسلام حیدر نے جملہ پورا کیا اور ایک گہری سانس لی۔''یہیں پیدا ہوا ہوں اور شاید یہیں دفن بھی ہو جاؤں مگر آج کے حادثے نے کئی سوال کھڑے کر دیے ہیں۔''

''آپ سوچتے بہت ہیں۔'' بیگم نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

''نماز کے لیے پانچ بار مسجد تو روز جانا ہی ہے۔ کتّوں کے ڈر سے اب کیا گھر میں ہی نماز پڑھوں۔ میرے لیے یہ بھی ممکن نہیں اور ایسے حالات میں مسجد جانا بھی.....؟ وہ کچھ سوچتے ہوئے خاموش ہو گئے۔

''ہاتھ میں کیسے کاٹ لیا.....؟ رقیہ نے سوال کیا۔

''وہ بھونکتا ہوا میری طرف بڑھا تو میں ہڑ بڑاہٹ میں گر پڑا اور ہاتھ میں اس کا دانت لگ گیا۔ بیگم نے اب تک زخم کی صفائی کر کے ایک پٹی لپیٹ دی۔ اسلام حیدر کتوں اور حملوں کے تعلق سے کچھ نہ کچھ بولتے رہے۔ کچھ دیر میں پانی گرم ہو گیا۔ نہانے کے لیے غسل خانے کا رُخ کیا مگر اس سے پہلے بیوی کو آواز دی۔''رقیہ ذرا فیروز کو فون کر کے بلا لو۔ ابھی اُس کے دُکان جانے میں وقت ہے۔ اسی کے ساتھ جا کر انجکشن لگوا آؤں۔''

''ٹھیک ہے میں فون کرتی ہوں۔ آپ نہا لیں..... انڈے بھی ٹھنڈے ہو گئے۔ میں گرم کیے دیتی ہوں اور چائے بھی بنا لیتی ہوں۔ پہلے والی تو بیکار ہو گئی..... چائے مجھ

''کواڑ بند کرنے کی بھی آپ نے خوب کہی۔ اب یہ احتیاط بھی دیکھنا رہ گیا تھا ورنہ ہمارے زمانے میں..... تو.....''؟

''چلتا ہوں..... بیگم..... اللہ حافظ.....۔''

اللہ حافظ کہہ کر بیگم رقیہ نے دروازہ بند کیا اور مصلیٰ اٹھا کر نماز کے لیے کھڑی ہو گئیں۔ معمول کے مطابق میاں کی واپسی تقریباً نصف گھنٹے بعد ہوتی۔ اس اثنا میں وہ ذکر واذکار سے بھی فارغ ہو جاتیں اور پھر دونوں بڑھیا بڑھے چائے کی چسکیوں کے ساتھ ماضی کی بازیافت اور عصر حاضر کا نوحہ کرتے۔

وہ پیالیوں میں چائے چھان رہی تھیں کہ دروازے پر کوئی آہٹ ہوئی اور پھر دروازہ پیٹنے کی آواز کانوں میں پڑی۔ یہ انداز تو حاجی جی کا قطعی نہیں تھا۔ اتنی صبح اور ہو بھی کون سکتا ہے.....؟ اس طرح کے سوالوں کے ساتھ وہ چوکھٹ کی طرف بھاگی۔ قریب آنے پر احساس ہوا کہ یہ حاجی جی ہی ہیں اور وہ کراہ بھی رہے ہیں۔ بیگم رقیہ ایکدم لرز گئیں۔ قدم جیسے جست ہو گئے۔ دروازہ کھلا..... اسلام حیدر حواس باختہ سے کھڑے تھے۔ بہت ڈرے ہوئے نظر آرہے تھے۔''خیریت تو ہے..... حاجی.....جی..... کیا..... ہو گیا.....؟''

''بیگم ..... اب یہاں کتوں کی تعداد بہت زیادہ ہو گئی ہے..... کتے تو یہاں پہلے بھی تھے مگر اس طرح کبھی حملہ آور نہیں ہوئے.....۔'' وہ ٹھہر ٹھہر کر بول رہے تھے۔ لہجے میں درد کے ساتھ خوف و ہراس بھی نمایاں تھا۔ بیگم اب تک معاملہ سمجھ چکی تھیں۔ ہاتھ پر دانت کے نشان بھی دیکھ لیے تھے جہاں پر خون چھلک آیا تھا۔

''ہاں رقیہ کہہ تو تم ٹھیک رہی ہو۔ پہلے یہ کاٹتے تو نہیں تھے۔ نئی شکل کو دیکھ کر غرانا یا بھونکنا الگ بات ہے مگر حملہ کرنا اور بات ہے۔ بیٹھے بٹھائے ایک مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ اب اس

www.urduchannel.in

سے گرم ..... نہیں پی جاتی ..... ''اسلام حیدر تولیہ اٹھا کر غسل خانے میں چلے گئے اور بیگم رقیہ باورچی خانے میں۔

فیروز اُن کا بھتیجا تھا۔ کچھ ہی فاصلے پر رہتا تھا۔ بڑوں کا ادب واحترام کرنے والا ۔یہی وجہ تھی کہ اپنی کسی ضرورت کے وقت یہ فیروز کو طلب کر لیتے اور وہ سر تسلیم خم اُن کی خدمت میں حاضر ہو جاتا۔

اُن کے انجکشن لگ چکا تھا اور وہ سو رہے تھے۔ فیروز صحن میں بیٹھا چاچی کے ساتھ مٹر چھیل رہا تھا۔ ادھر اُدھر کی گفتگو کے بعد تان کتوں پر ہی آ کر ٹوٹ جاتی۔

صبح کے معمولات سے فارغ ہو کر اسلام حیدر تھوڑی دیر آرام کرتے۔ پھر اٹھ کر ناشتہ کرتے۔ اس کے بعد دیگر کام۔

ملازمت سے سبک دوشی کے بعد طرز زندگی کافی تبدیل ہو گئی تھی۔ وہ دونوں اپنی زندگی سے بہت مطمئن تھے۔ تنہائی کے علاوہ کوئی غم نہیں تھا۔ بچوں کی تمام ذمے داریوں سے ملازمت کے دوران ہی فراغت حاصل کر لی تھی۔ بیٹے اعلا تعلیم حاصل کر کے بیرون ملک میں جا بسے تھے۔ دو بیٹیاں تھیں، وہ اپنے گھروں کی ہو گئیں تھیں۔ لڑکیاں اسی شہر میں تھیں مگر بچوں کے اسکول کی وجہ سے یہاں رکنے میں دقت ہوتی۔ اتوار یا چھٹیوں میں وہ پھیرا لگا لیتیں۔ کہتے تو لوگ یہ ہیں کہ بیٹے والدین کے بڑھاپے کا سہارا ہوتے ہیں مگر یہاں تو صورت حال قطعی مختلف تھی، یہاں تو ساری آماجگاہ بیٹیوں کے دم سے تھی۔ ایسا نہیں تھا کہ لڑکے لائق نہیں تھے یا ان کی تربیت میں کچھ کمی رہ گئی تھی۔ بس ذرا سوچنے کے نظریے میں فرق تھا۔ وہ خاصے پیسے بھیج رہے تھے۔ ان کے سامنے کوئی مسئلہ رکھا جاتا تو وہ بس خرچ پوچھتے اور مطمئن ہو جاتے، کام کے لیے ملازم رکھنے کی تاکید کرتے۔ آپ لوگ کچھ نہ کریں ۔کھانا پکانے کے لیے بھی ایک خانسا ماں رکھ لیں۔ جتنے پیسے مانگیں ..... دے .....

دیں..... بس آپ لوگ کوئی کام نہ کریں..... وغیرہ..... وغیرہ..... غرضیکہ وہ جتنی دیر بات کرتے، یہی کہتے کہ یہ یہ کھالیں..... یہ ..... پی ..... لیا کریں ..... علاوہ ازیں جس چیز کی ضرورت ہو..... حکم..... کریں.....۔

بیٹوں کے مشوروں کو عملی جامہ بیٹیاں ہی پہناتیں۔ وہ جتنی دیر گھر میں رہتیں، ماں باپ کی خدمت ہی کیا کرتیں۔ جاتے وقت انہیں لگتا کہ جیسے اب بھی کچھ کمی رہ گئی ہے ۔والدین کو معلوم تھا کہ بیٹوں کے یہ جذبات ان میں اگلی آمد تک توانا رکھیں گے۔ ایک بار جاتے وقت اسلام حیدر نے بیٹیوں کو مخاطب کر کے کہہ بھی دیا تھا کہ تم لوگ wi-fi کے Pass word کی طرح ہو۔ تمہارے آنے سے سانسوں کا زیرو بم تیز ہو جاتا ہے۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد وہ سو کر اٹھ گئے۔ آنکھیں کھلیں، چند لمحوں میں ہوش وحواس بھی درست ہو گئے۔ وہی منظر ایک بار پھر تازہ ہو گیا۔ کتے کا کسی انسان پر حملہ کوئی ایسی بات نہیں تھی جس پر حیرت کا اظہار کیا جائے۔ انہیں تعجب اس بات پر تھا کہ اتنے برسوں تک جاننے کے بعد بھی حملے کے امکان ختم نہیں ہوتے خواہ کتا پاگل ہوا ہو یا نہیں۔

انہیں سب سے زیادہ یہی بات پریشان کر رہی تھی۔ یہ زخم تو چند روز میں ختم ہو جائے گا۔ اس بے اعتباری کا کیا کریں جو اس حادثے کے بعد قائم ہو گئی ہے۔ اس خوف وہراس سے کیسے نمٹیں جو سردی کے ساتھ سہرن پیدا کر رہا ہے۔ مستقل گھر میں تو قید نہیں رہا جا سکتا۔ ضروریات کو تو آگے پیچھے بھی کیا جا سکتا ہے..... مگر..... نماز کے لیے تو پانچ نماز جانا ہی ہے..... یہ..... سب کیسے ہوگا.....؟ کیا وہ اپنے اندر اتنی ہمت جٹا پائیں گے۔ ایسے اور بھی سوالات تھے جو انہیں پریشان کر رہے تھے۔

کتوں کے بارے میں انہیں ضرورت بھر کی معلومات تھی۔ تھوڑا بہت اُن کی نفسیات سے بھی واقف تھے مگر ان باتوں سے اسے حملہ کرنے سے تو نہیں روکا جا سکتا۔ کتا

www.urduchannel.in

چاہے گلی میں پھرنے والا دیسی، مریل، خارش زدہ ہو یا کسی انگریزی نسل کا۔ علاج کے طریقے میں نسل کے امتیاز کا کچھ دخل نہیں۔

''آپ..... اٹھ..... گئے..... چائے پئیں گے یا ناشتہ کریں گے۔'' باہر سے رقیہ کی آواز آئی۔ ان کے خیالات اور سوچ کا تانا بانا بکھر گیا۔

''آرہا ہوں..... بیگم..... چائے اب ناشتے کے بعد ہی''۔ جواب دے کر وہ بستر سے اٹھ گئے۔

ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہو کر انہوں نے اخبار اٹھا۔ ''بیگم..... ذرا..... اوپر چھت پر جارہا ہوں۔ دھوپ کھانے..... تم..... جب آنا..... تو میری..... دوا لیتی آنا..... اور..... پانی..... بھی''۔ ''ناشتے کے بعد والی گولیاں وہ خاکی پڑیا میں ہیں نہ''۔ رقیہ بیگم نے استفسار کیا..... ''ہاں وہی..... ہیں.....'' کہتے ہوئے وہ آگے بڑھ گئے۔

اوپر آکر کرسی ایسے زاویے پر رکھی جہاں سے دھوپ پشت پر پڑے۔ عینک نکال کر کپڑے سے شیشہ صاف کیا اور لگا کر اخبار پڑھنے لگے۔ پہلی سرخی پر نظر پڑتے ہی چہرے پر یکے بعد دیگر کی رنگ آئے اور چلے گئے..... ''یا اللہ.....'' سرگوشی کی سی انداز میں نکلا۔ جیسے جیسے خبر کی تفصیل پڑھتے گئے چہرے پر بے چارگی اور اضمحلال کے سے تاثرات گہرے ہوتے گئے۔ ایک حادثہ جو گزشتہ ماہ ایک دوسرے شہر میں واقع ہوا تھا اسی سے متعلق فورینسک رپورٹ (Prensic Report) شائع ہوئی تھی۔

اقلیتی طبقے کے ایک معمر شخص کو عیدالضحیٰ کے موقع پر کچھ شر پسندوں نے گھر سے نکال کر یہ کہتے ہوئے قتل کر دیا تھا کہ تمہاری فریج میں گائے کا گوشت ہے۔ وہ جب تک زندہ رہا، اس الزام کی نفی کرتا رہا مگر انہوں نے ایک نہ سنی اور اس بے ضرر اور بے گناہ آدمی کو

موت کی نیند سلا دیا۔ اس معاملہ نے بہت طول پکڑا۔ اخبار اور News Chanels پر بحثیں شروع ہو گئیں۔ ملک گیر سطح پر اس کی مذمت بھی ہوئی۔ ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں تھی جو اُن شر پسند عناصر کی پیروی کر رہے تھے۔ فسطائی طاقتیں ان لوگوں کی نہ یہ کہ صرف حوصلہ افزائی کر رہی تھیں بلکہ ان کے دفاع کے لیے ڈٹ کر سامنے کھڑی تھیں۔

آج اس رپورٹ سے یہ ثابت ہو گیا تھا کہ فریج میں رکھا ہوا گوشت بکرے کا ہی تھا۔ اسلام حیدر نے اخبار رکھ دیا۔ ایک عجیب سی کیفیت میں مبتلا تھے جیسے لق و دق صحرا میں وہ اپنوں سے بچھڑ گئے ہوں۔ ایسا ملک تو نہیں تھا..... ایسے لوگ بھی نہیں تھے..... کہیں باہر سے تو نہیں آئے ہم ان ہی لوگوں کے ساتھ تو رہے ہیں..... ملک کی تقسیم میں ہمارے اجداد نے ترک وطن نہیں کیا اور اس بات پر ہمیں کبھی پچھتاوا بھی نہیں ہوا..... تو..... پھر..... وہ اپنے ہی سوالوں سے گھرے ہوئے تھے۔ کسی کے قدموں کی آہٹ سے گردن گھمائی۔ بیگم دوا کی پڑیا اور پانی کی بوتل لیے کھڑی تھیں..... ''دیکھو میں اردو کا اخبار کیوں خریدتا ہوں''۔ بیگم نے وہ سرخی دیکھ لی تھی۔ معاملے کی نزاکت کو بھانپ کر انہوں نے میاں کو گولی کھلائی اور ذہن ہٹانے کی غرض سے بولیں کہ ''بیٹیوں کو فون کریں۔ اگر ہو سکے تو آجائیں..... آج..... بریانی کھانے کی خواہش ہو رہی ہے۔ اس وقت طبیعت اتنی مکدر تھی کہ بریانی کا خیال بھی اس کثافت کو دور نہیں کر سکتا تھا۔ بیویوں کو بھی شوہروں کی دکھتی رگوں کے بارے میں خوب پتا ہوتا ہے۔ بیٹیوں کے ذکر پر البتہ چہرے پر نرمی سی جھلک آئی۔ بالآخر فون اٹھا کر نمبر ملانے لگے۔ بڑی والی سے کہا کہ چھوٹی شام کو آرہی ہے۔ اگر تم بھی آ..... جا..... تیں..... تو..... اچھا لگتا۔ یہی بات گھما کے چھوٹی سے کہی۔ وہ جانتے تھے کہ بچیاں اس کے بغیر بھی آجاتی ہیں مگر وہ بیٹیوں سے تھوڑا بہت مذاق بھی کیا کرتے تھے۔ انہیں خود کو بھی تو مطمئن کرنا ہوتا۔ ممکن ہے کسی کی، کوئی مصروفیت ہی ہو۔ ایسے

www.urduchannel.in

انکار کرنے میں تکلف ہوگا۔اس طریقے سے بلانے پر وہ آپس میں فون پر بات بھی کر سکتی ہیں اور پھر آخر میں ماں کو فون کر تفصیل بتائیں گی اور پکوان کے متعلق تبادلۂ خیال کریں گی۔

بڑھیا، بڑھے کئی برسوں سے اکیلے رہ رہے تھے مگر ابھی تک اس کے عادی نہیں ہو پائے تھے۔بچپن سے بھرے پورے گھروں میں رہنے کی عادت تھی۔بیٹے پڑھ لکھ کر کسی قابل ہوئے تو دور دیس جا بسے۔ذرا سا موقع یا بہانا ملتا تو بچیوں کو بلا لیتے اور چہل پہل دیکھ کر خوش ہوتے۔

اسلام حیدر زندگی کے اس مرحلہ میں تھے جہاں صرف ماضی کی بازیافت اور محاسبہ ہی باقی رہ جاتا ہے۔پیچھے مڑ کر دیکھتے ہیں تو سکون اور اطمینان کی دور تک پھیلی ہوئی شاہراہ نظر آتی ہے۔لیے گئے کچھ غلط فیصلوں کے پیوند اور گڈھے بھی نظر کے سامنے ہیں۔

بچوں کی پرورش وتربیت میں کیا کوتاہی ہوئی جو اُن کی ترجیحات میں پیسہ آ گیا ۔ستم یہ ہے کہ وہ اس چیز سے واقف بھی نہیں۔دن میں کئی بار خیریت دریافت کرتے ہیں ۔ہر بار خرچ اور ضرورت کے بارے میں پوچھتے ہیں اور صرف زبانی جمع خرچ نہیں۔وہ اشارہ بھر کر دیں جتنے پیسے کہیں یا کسی چیز کا مطالبہ کریں، چند گھنٹوں میں ان کی دسترس میں ہوتی۔

ماں باپ کو چاہیے تھا بچوں کی قربت۔گھر پوتی پوتوں کے شور سے بھرا ہو، سارا سامان تتر بتر ہو۔وہ گھر کی صفائی ستھرائی اور سلیقے سے تنگ آ گئے تھے۔اتنے جتن اور جدوجہد سے آراستہ کیا گیا گھر انہیں بے چین کر دیا تھا۔گھر کی چیز ہی بے ترتیب ہوں تو اُن میں راحت محسوس ہو۔ایسا نہیں تھا کہ انہوں نے اپنی خواہش کا اظہار نہیں کیا۔ناراضگی تک دکھائی مگر بیٹے والدین کے کرب کو سمجھ ہی نہ سکے۔بس ہے تسلی ہر بار..... کہ ..... بہت جلد ہی رخت سفر باندھ لیں گے۔انتظار اتنا طویل ہوتا گیا کہ اب ان کی زبان پر حرف

شکایت بھی نہیں آتا۔اپنے لیے خوشی کے لمحات وہ بیٹیوں کی آمد سے کشید کر لیتے اور اب زندگی کا یہی ڈھب باقی رہ گیا تھا۔خوش ہونے کی حالاں کہ ان کے پاس کچھ اور بھی وجوہات تھیں۔کوئی فرد کسی مہلک بیماری میں مبتلا نہیں تھا۔کسی مقدمے میں نہیں پھنسے تھے۔قناعت اور درگزر کرنے والا مزاج تھا، اس کی وجہ سے بھی خاصی راحت تھی۔کتے کے حملے نے البتہ ان کی پرسکون زندگی میں ہلچل پیدا کر دی تھی۔وہ آئندہ کے لیے زیادہ ڈر گئے تھے۔اللہ اس کا بھی کوئی راستا نکالے گا۔اس طرح کی باتوں سے خود کو اطمینان دلانے کی کوشش کرتے۔

چند روز بعد معلوم ہوا کہ محلے کی کسی خاتون کو کتے نے کاٹ لیا ہے۔مندمل ہوتے زخم پھر سے ہرے ہو گئے۔یعنی یہ معاملہ ابھی ختم نہیں ہوا تھا اور میرے اوپر حملہ محض اتفاق نہیں تھا۔یہ کتا کہیں پاگل تو نہیں ہو رہا ہے؟ تعجب ہے کوئی کچھ کر کیوں نہیں رہا ہے۔اور کتنے لوگوں کو کاٹنے کا انتظار کیا جا رہا ہے۔اگر خود کچھ نہیں کر سکتے تو کانجی ہاؤس میں شکایت درج کرا انہیں پکڑوانے کے لیے اقدامات کریں۔تبھی انہیں خیال آیا کہ دوسروں سے تو کرنے کے بجائے انہیں خود پیش رفت کرنی چاہیے۔صبح فیروز کو بھیجتا ہوں۔کوئی راستا تو نکلے گا.....ہی.....؟

پورے علاقے میں کتے گفتگو کا موضوع بن گئے تھے۔کاٹنے والا تو ایک تھا مگر قدر و قیمت سب کی بڑھ گئی تھی۔ہر ایک کی نقل وحرکت پر نظر رکھی جا رہی تھی۔

دراصل یہ ایک ملی جلی والی آبادی والا محلّہ تھا۔کتوں کی وفاداری اور ان کے پالتو ہونے میں کوئی اختلاف نہیں تھا مگر مسلمان اور ہندو کا مجموعی نظریہ یکساں نہیں تھا اور انہیں یہاں سے ہٹانے میں یہی بات آڑے آ رہی تھی۔بظاہر وہ بھی مذمت کر رہے تھے مگر کتوں کو روٹیاں بھی وہی لوگ ڈال رہے تھے۔پاکی ناپاکی کا فرق تو بہرحال قائم رہے گا ہی۔

www.urduchannel.in

وقت نازک تھا۔سختی برتنے سے ماحول خراب ہونے کا اندیشہ تھا۔لوگ ایسے موقعوں کی تاک میں تھے۔ذراسی چوک شہر کے پرامن ماحول کوخراب کرسکتی تھی۔

صبح انہوں نے فیروز کو شکایت درج کرنے کے لیے بھیجا مگر وہ خالی ہاتھ آ گیا ۔اس کی کیا بساط تھی کہ وہ کل کا بچہ بغیر پیسے دیے کسی سرکاری دفتر میں شکایت درج کرادے۔ سب دروازے انہیں بند نظر آرہے تھے۔تو کیا خاموش رہ کر یہ تشدد برداشت کیا جائے گا.....؟

وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔کتوں کے حملے ہنوز جاری تھے۔آئے دن کسی نہ کسی کو کاٹنے کی خبریں مل رہی تھیں۔جب انہیں لگنے لگتا کہ شاید مسئلہ ختم ہو رہا ہے تبھی ادھر ادھر سے خبر ملتی کہ فلاں کو فلاں کتے نے کاٹ لیا۔معاملہ اب ان کے گلی سے آگے بڑھ گیا تھا۔ دوسرے محلوں سے بھی یہ خبریں آنے لگیں تھیں۔اسلام حیدر نہایت شریف اور سادہ لوح آدمی تھے۔دوبارہ حملہ سہنے کی نہ ان میں تاب تھی اور نہ ہمت۔احتیاط کے طور پر فجر کی نماز گھر پر ہی پڑھنے کو مجبور تھے۔دیگر نمازوں کے لیے فیروز کی ڈیوٹی لگا دی تھی۔وہ ساتھ میں ایک ڈنڈا بھی لے کر چلتا۔کسی وقت وہ موجود نہ ہوتا تو وہ مسجد جانے کی ہمت نہ جٹا پائے ۔ دروازے کی آڑ میں کھڑا ڈنڈا بھی ان کی ہمت افزائی میں ناکام رہتا۔

وہ اس اسیری سے بہت تنگ آ گئے تھے بلکہ اُکتا گئے تھے۔باقی تو سب جیسے تیسے چل ہی رہا تھا مگر جماعتیں چھوٹنے کا انہیں بہت قلق تھا۔احساس گناہ بھی بڑھتا جا رہا تھا اور جیسے وہ اندر سے مسمار ہوتے جا رہے تھے۔عجب اُفتاد آن پڑی تھی۔اچھی بھلی سکون سے زندگی گزر رہی تھی۔بیٹھے بٹھائے ایک ایسے مسئلے پر گرفتار ہو گئے تھے جس سے دہائی کے امکان معدوم ہوتے جا رہے تھے۔

اسلام حیدر کے پاس کسی کا فون آیا۔وہ کافی دیر تک باتیں کرتے رہے۔رقیہ سمجھ

گئیں تھیں کہ یہ اسلم بھائی کی Call ہے، دوگلی چھوڑ کر ان کا مکان ہے۔وہ میاں کے دیرینہ دوست ہیں۔ہم خیال اور ہم مزاج بھی۔فون منقطع ہوا تو وہ رقیہ سے مخاطب ہوئے۔اسلم کا فون تھا۔پائے کی دعوت ہے۔میں بھی سوچ رہا تھا کہ کسی روز فیروز سے پائے منگوالوں .....بیٹیاں بھی آجائیں گی اور اسلم کی فیملی کو بلا لیں گے مگر وہ تو ہم سے آگے نکل گیا۔اس فون نے اسلام کے لیے دوا کا کام کیا۔چہرے پر قدرے بشاشت آ گئی تھی۔کئی دنوں سے طاری کثافت میں کچھ کمی واقع ہوئی تھی۔'پائے' اسلام حیدر کی کمزوی تھے۔سردیوں میں وہ کئی بار اہتمام کرتے۔یہی حال ان کے دوست اسلم کا بھی تھا۔وہ درس وتدریس کے شعبے سے سبکدوش ہوئے تھے۔بہت نستعلیق آدمی تھے۔اسلام حیدر سے عادت واطوار میں بھی کافی مماثلت تھی۔شاید اتنے برسوں تک دوستی کی اساس ٹکے رہنے کی یہی وجہ بھی تھی۔

اگلے روز وہ کھانے کے وقت سے کافی پہلے اسلم کے یہاں پہنچ گئے۔سب بہت خوش تھے۔پائے کی خوشبو پورے گھر میں پھیلی ہوئی تھی۔مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی ۔رہ رہ کر پائے کے فوائد اور ذائقے پر بھی اظہار خیال ہوتا رہا۔

دسترخوان لگنے کا وقت بھی آ گیا۔بھوک بھی شدت کی لگی ہوئی تھی۔اسلام نے ناشتہ بھی بہت ہلکا ہی کیا تھا۔سب نے خوب سیر ہو کر پائے کھائے۔جی بھر کے ہڈیاں چوسیں.....نلیاں جھاڑیں۔انگلیاں آپس میں چپکنے لگیں۔اسلام حیدر اور اسلم کے چہروں پر پسینہ چھلک آیا.....پائے کتنے ہی کھالو مگر نیت نہیں بھرتی۔انہیں معلوم تھا کہ چلتے وقت بھابھی باندھ کر بھی دیں گی۔خوب جی بھر کے اسلم کی بہو کی تعریفیں ہوئیں۔ڈھیروں دعاؤں سے نوازا گیا۔

کھانے سے فارغ ہو کر مرد حضرات ڈرائنگ روم میں آ گئے۔پھر ادھر اُدھر کی باتیں شروع ہو گئیں.....یار.....اسلام.....انتخاب نزدیک ہیں.....تم دیکھ رہے

www.urduchannel.in

ہو..... ملک میں کیا ہو رہا ہے۔اب تشویش ہونے لگی ہے۔اسلام حیدر نے تائید کی اور اپنا مطمح نظر بھی واضح کیا۔دورانِ گفتگو کتوں کے حملے کا تذکرہ بھی نکل آیا۔اسلم نے بتایا کہ ان کی طرف کے کتے بھی خاصے سرکش ہو گئے ہیں۔اس طرف بھی کئی واقعات ہو چکے ہیں..... لوگ..... ڈرے ہوئے ہیں.....۔''

دیر رات اسلام حیدر اپنے گھر کے لیے نکلے۔رات کے اندھیرے میں اپنے گھر تک محفوظ پہنچنے کے خدشات کے تحت انہوں نے اسلم کے بیٹے کو ساتھ چلنے کے لیے کہا کہ بیٹا ذرا گھر تک چھوڑ دو۔وجہ اسے بھی معلوم تھی۔وہ خندہ پیشانی سے راضی تھا۔پیدل کا راستا تھا۔انہوں نے چھڑی یا کوئی ڈنڈا لینے کا مشورہ دیا مگر اُس نے نظر انداز کر ان کی ہمت افزائی ۔''چچا آپ بالکل فکر نہ کریں..... میرے ساتھ چلیے۔ میں ساتھ خیریت کے پہنچا دیتا ہوں.....اس بہانے دیکھ بھی لوں گا اس کتے کو.....۔''

اللہ اللہ کر کے وہ گھر پہنچ گئے۔اپنی گلی میں قدم رکھتے ہی زیادہ محتاط ہو گئے..... کتے انہیں نظر نہیں آئے.....انہوں نے راحت کی سانس لی۔وہ بولے اگر میں تنہا ہوتا تو یہ کمبخت ضرور دکھتے۔تمہیں لے آیا تو کیسے کہیں دُم دبا کے غائب ہو گئے۔''آخر وہ ساتھ خیریت کے اپنی دہلیز تک آ گئے۔

ساتھ آئے لڑکے کو چائے کے لیے روکا۔اس نے معذرت کر لی۔انہوں نے ضد نہیں کی۔سنبھل کر جانے کی تلقین کی۔کچھ دعائیں دیں۔وہ اللہ حافظ کہہ کر رخصت ہو گیا۔یہ لوگ اندر آ گئے۔

صبح فیروز کو کسی ضرورت کے لیے فون کیا تو پتا چلا کہ اس کے پیر میں کتے کا دانت لگ گیا ہے۔ابو کے ساتھ اسپتال گیا ہے۔اس کے بعد انہیں جیسے کچھ سنائی نہیں دیا۔نظروں کے سامنے کچھ ہیولے سے اڑنے لگے۔فون بند کر کے کنارے رکھ دیا۔ بہت دیر تک

خاموش بیٹھے رہے۔رقیہ کمرے میں آئی تو انہوں نے نوٹس بھی کیا۔قدرے توقف کے بعد استفسار کیا..... کیا..... ہوا..... خیریت تو ہے.....ایسے کیوں بیٹھے ہیں.....؟

''رقیہ.....اب..... ہم..... یہاں نہیں رہیں گے۔ہم نے فیصلہ کر لیا ہے ..... جلد از جلد یہ مکان چھوڑ کر اپنوں کے بیچ چلے جائیں گے۔اب مزید.....اس خوف و ہراس کے ماحول میں رہنا میرے لیے..... ممکن نہیں۔''.....لہجے میں عجیب سی سرد مہری تھی۔رقیہ بیگم انہیں تکے جا رہی تھیں اور وہ بولے جا رہے تھے..... گلی میں بہت سارے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں..... آ رہی..... تھیں.....۔

❁❁❁

www.urduchannel.in

خرگوش

مچھر کے کاٹنے سے چودھری ضیاء الدین کی آنکھ کھلی، کمرے میں نائٹ بلب روشن تھا مگر اس روشنی میں ادنیٰ سے مچھر کی تلاش ممکن نہیں تھی۔ بتی جلا کر تلاش کر بھی لیتے تو کیا ہو جاتا کوئل یا رِفل جلانے سے نفسیاتی طور پر اطمینان کا احساس ہوتا ہے۔ نظر گھما کر دیکھا۔ بیگم برابر میں بے خبر سوئی ہوئی تھیں۔ مچھروں سے دفاعی اقدامات کی ذمہ داری انہیں پر تھی۔ اب پتا نہیں کہ آج وہ جان بوجھ کر بھول گئیں یا اپنے جذبے کی تسکین کے لیے انہیں آزاد چھوڑ دیا گیا تھا۔ چوں کہ مچھر انہیں نہیں کاٹتے تھے یا اگر کاٹتے بھی ہوں تو بہر حال انہیں احساس نہیں ہوتا تھا۔

چودھری ضیاء الدین نے آنکھیں جھپکا کر پوری کھول دیں، انہیں یاد آیا کہ وہ آج جلدی سو گئے تھے۔ سر میں کچھ درد سا تھا، کھانے کی خواہش بھی نہیں تھی۔ بہو نے چائے بنا دی۔ ایک گولی کھا کر چائے پی اور سو گئے۔ کتنی دیر تک سوئے، یہ جاننے کے لیے گھڑی دیکھی۔ ابھی بارہ ہی بجے ہیں۔ ایسے وقت اور ان حالات میں وہ کریں بھی تو کیا؟ بتی تک تو جلا نہیں سکتے۔ وجہ بیوی کی محبت یا لحاظ نہیں بلکہ خوف تھا اور یہ راز اُن دونوں کے علاوہ بھی بہت سے لوگوں کو معلوم تھا۔

کروٹ بدل کر آنکھیں بند کیں تو سب سے پہلے کولر کی آواز مخل ہوئی۔ اس سے بھی چھٹکارے کا کوئی راستا انہیں نہیں معلوم تھا۔ کولر سے نکلتی ہوئی بھر..... بھر کی آواز آج کچھ زیادہ ہی تیز تھی۔ شاید پنکھے کے بیرنگ کٹ رہے ہیں یا شاید گریسنگ مانگ رہا ہو۔ سوچتے ہوئے یہ طے کیا کہ یہ معاملہ صبح ہی دیکھا جائے گا۔ ذہن ادھر سے ہٹانے کی کوشش کی۔ کسی حد تک کامیاب بھی ہوئے مگر بیچ بیچ میں آواز کی کرختگی ذہن منتشر کر ہی جاتی۔ اسی وقت الماری میں کچھ کھڑ پٹر سی ہوئی۔ توجہ کے ساتھ نظر بھی ادھر گئی۔ ضرور کوئی چوہیا ہو گی..... مگر چوہیا ہی کیوں؟ چوہا بھی تو ہو سکتا ہے۔ خود سے ہی سوال جواب کرتے رہے۔

یہ تماشا آئے دن کا تھا۔ اس لیے ایک چوہے دان لے کر آئے تھے۔ کبھی تو دن میں کئی شکار ہو جاتے اور کبھی ایک بھی نہیں، حالاں کہ گھر میں بلی موجود تھی لیکن گھر بڑا ہونے کی وجہ سے بلی کو زیادہ وقت درکار ہوتا۔

پتا نہیں بیوی نے گھی لگی روٹی کے ساتھ چوہے دان لگایا کہ نہیں۔ لگایا بھی ہو تو کیا فائدہ؟ یہ تو یہاں اچھل رہا ہے۔ چوہے بھی کم ہوشیار نہیں ہیں۔ الماری میں چوں کہ اُن کی کتابیں رکھی ہوئی تھیں گو کہ وہاں کا فور وغیرہ بھی ڈالا تھا پر دھڑکا تو لگا ہی رہتا کہ کون جانے کب کس کتاب کی شامت آ جائے۔ چوہے کی اچھل کود اب تک جاری تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی انہیں اٹھنا پڑا۔ یہ احتیاط رکھا کہ اُن کی طرف سے کوئی شور شرابہ نہ ہو ورنہ بیگم اٹھ گئیں تو مشکلات اور بڑھ جائیں گی۔

ملگجی روشنی کی وجہ سے چیزیں بہت واضح نہیں تھیں مگر نظر آ رہی تھیں۔ الماری کے خانوں میں ہاتھ ڈالا تو ایک چوہا ان کے دامن پر کودا اور سن سے باہر۔ اطمینان ہوا کہ اس وبال سے تو چھٹکارا ملا۔ آہستگی سے آ کر پھر سے لیٹ گئے۔ کہنی سے موڑ کر دایاں ہاتھ آنکھ پر

www.urduchannel.in

رکھا۔کرتے کی آستین کہنی سے نیچے سرک گئی تھی۔چندلمحوں بعد گرم سانسیں ہاتھ کے اس حصے پر محسوس ہوئیں، ہاتھ سیدھا کرلیا۔آنکھیں بند کیں، نیند کا اب بھی کچھ اتا پتا نہیں تھا۔ بڑا دشوار گزار مرحلہ تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کریں اور کیا نہ کریں۔ پہلے بھی ایسے حالات سے جوجھ چکے ہیں اور ہر بار شکست ان ہی کے مقدر میں آئی۔ لیٹے رہنے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ تھا۔سو لیٹے رہے۔ذہن میں ادھر اُدھر کی باتیں آتی رہیں۔تھوڑی دیر بعد بوتل اٹھا کر پانی پیا کہ حلق سوکھنے لگی تھی۔

چند منٹ بعد طوطے کی آواز سنائی دی۔تو یہ بھی جاگ رہے ہیں۔شاید چوہے کی آواز سے اس کی بھی آنکھ کھل گئی ورنہ رات کے اس پہر میں مٹھو خواہ مخواہ شور نہیں کرتا۔ایک تو اس عورت نے گھر کو چڑیا گھر بنادیا ہے۔ایک بلی تھی، ایک میمنہ جو اَب خاصا بڑا ہوگیا تھا۔ تقریباً دو ماہ قبل ایک خرگوش بھی بیگم کی چشم التفات کی زد میں آگیا۔

تیس برس کا طویل عرصہ اس عورت کے ساتھ گزرا ہے۔اتار چڑھاؤ تو سبھی کی زندگی میں آتے ہیں مگر ضیا کی آزدواجی زندگی بڑی اتھل پتھل والی رہی۔ بہت تلخیاں ہوئیں بلکہ زیادہ وقت تلخی میں ہی گزرا۔کیا کوئی اور بھی گزار سکتا تھا؟ اپنے آپ ہی سے سوال کرتے۔چوں کہ وہ بہت صبر وقناعت والے آدمی تھے۔بدزبانی سے انہیں چڑھ تھی۔بیگم اس ہنر میں اتنی ہی طاق تھیں۔جلی کٹی سنانے کے لیے انہیں موقعہ یا بہانے کی چنداں ضرورت نہیں پڑتی۔

وہ یاد کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ شادی کے وقت انہوں نے شکرانے کی نماز پڑھی تھی یا نہیں۔اگر پڑھی تھی تو مطلب صاف ہے، قبول نہیں ہوئی اور اگر نہیں پڑھی تو کیا صرف ان دو رکعت کی وجہ سے زندگی اجیرن بنی ہے۔نماز تو وہ اوائل عمری سے پڑھ رہے ہیں اور پابندی وقت ہی نہیں بساط پھر خشوع وخضوع کی کوششوں کے ساتھ۔خشوع وخضوع کے

جن معنی سے وہ واقف نہیں۔ ہر نماز میں وہ ایک دعا کا خاص اہتمام کرتے کہ بیوی کے مزاج میں تھوڑی نرمی پیدا کردے۔ یہ دعا بارگاہ خداوندی میں ہنوز قابل اعتنا نہیں سمجھی گئی۔ یہ چودھری ضیاء الدین کا خیال تھا۔اس کے باوجود پابندی سے نماز پڑھتے رہے اور بیوی کی ترشی بھی جھیلتے رہے۔

فجر کی آذان کانوں میں پڑی تو ایک دم ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔فجر کی اذان اور اذانوں کے مقابلے زیادہ گونجتی ہے۔حالاں کہ ہڑبڑاہٹ کی وجہ یہ نہیں تھی۔دیر سے سونے کے سبب لاشعور میں کہیں یہ خدشہ بھی تھا کہ قضا نہ ہوجائے۔ہوش وحواس درست ہونے میں کچھ وقت لگتا ہے۔تبھی انہیں یاد آیا کہ آخری بار جب گھڑی دیکھی تھی تو دو بجے تھے یعنی وہ دو بجے تک جاگتے ہی رہے۔اس کے بعد کب نیند آئی یہ نہیں معلوم، اٹھ کر بیٹھے تو احساس ہوا کہ آنکھوں میں کچھ جلن سی ہے۔بستر چھوڑ کر حوائج ضروری کے لیے باہر آگئے۔

وضو سے فارغ ہوئے تب تک بیوی بھی اٹھ کر باہر آچکی تھیں۔نمازوں کی پابند وہ بھی تھیں۔چودھری ضیا کو امید تھی کہ میری نہ سہی بیگم کی نمازیں کبھی نہ کبھی اپنا اثر ضرور دکھائیں گی اور فگار دل کے چھالے پھوٹ جائیں گے۔

وہ دروازہ بھیڑ کر مسجد کے لیے نکل گئے اور منکوحہ مصلیٰ بچھا کر اللہ کے حضور سجدہ ریز ہوگئیں۔نماز سے فارغ ہوکر دیر تک پنج سورہ، مسنون دعائیں اور وظیفے پڑھتیں۔مسجد سے لوٹ کر ایک کونے میں ضیا بھی ایسے ہی اعمال میں مصروف ہوجاتے۔اب بیٹے بہو کی آہٹیں آئیں اور چندلمحوں بعد پہلے بہو اور پھر صاحبزادے کمرے سے نمودار ہوئے۔ضیا ایک شفیق باپ کی طرح انہیں ہمیشہ نمازوں کی پابندی کے لیے ٹوکتے اور وہ دونوں سعادت مند اولاد کی طرح سنتے اور اگلی نماز سے شروع کرنے کا حتمی وعدہ بھی کرتے اور جمعہ کو باقاعدگی سے وفا کرتے۔گھر میں بظاہر کسی طرح کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔پرانے زمانے کا

www.urduchannel.in

خوب بڑا سا گھر، اونچی چھتوں والے بڑے بڑے کمرے، دالان، کشادہ صحن، جہاں کچھ پیڑ پودوں کا بھی اہتمام تھا۔ مکینوں میں چار بالغ افراد تھے اور دو بچے۔ ایک ضیا کا پوتا تھا اور دوسری پوتی۔ ضیا کی اپنی بھی دو بیٹیاں تھیں جو شادی کے بعد اپنے گھروں کی ہو چکی تھیں۔ اسی شہر میں تھیں اس لیے اکثر آ جاتیں اور بچوں کی چھٹیوں میں رہنے بھی آتیں۔

چودھری کی کپڑا بازار میں اپنی ایک پرانی اور بڑی سی دکان تھی۔ کپڑے کا پشتینی جما ہوا کاروبار تھا جہاں باپ بیٹے دونوں بیٹھتے تھے۔ چوں کہ اب سلے سلائے کپڑوں کی خاصی مہنگی دکانیں بلکہ Show Room کھل گئے ہیں جس سے کاروبار پر بہت فرق پڑا ہے مگر گھر گرہستی آسودگی سے چل رہی تھی۔ اللہ کا کرم و احسان تھا کہ کسی کو کوئی بیماری، آزاری نہیں اور نہ ہی کسی طرح کے مقدمے میں پھنسے تھے۔ لے دے کر وہی ایک مسئلہ تھا جو چودھری کو ہلکان کیے تھا۔ حالاں کہ طلعت آرا کا مزاج برا نہیں تھا۔ جب موڈ اچھا ہوتا تو ضیا کو لگتا کہ اس سے بہتر بیوی اور کون ہے؟ مگر جب کوئی بات بری لگ جاتی تو زبان قینچی کی طرح چلتی اور کیا کیا منہ سے نکلتا، انہیں خود بھی ہوش نہ رہتا۔ کون سی بات بری لگ جائے گی، یہ تیس برس بعد بھی نہیں معلوم ہو سکا۔ اس کے برخلاف ضیا کم سخن اور خوش طبیعت کے آدمی تھے۔ چہرے سے سنجیدگی اور بردباری جھلکتی تھی۔ شعر و ادب کے مطالعہ کا شوق تھا اس لیے بیوی کے زہر بجھے جملوں کا اثر دیر تک رہتا۔ وہ معنیٰ بھی اخذ کرتے جو بیگم کے ذہن میں نہیں ہوتے اور اندر ہی اندر سخن گسترانہ کی داد بھی دیتے۔ باوجود اس کے آزار بنا ہوا تھا۔

چائے وغیرہ سے فارغ ہو کر وہ اخبار لے کر بیٹھ گئے۔ بیگم جانوروں کی خدمت میں لگی ہوئی تھیں۔ گھر میں پلی ان بے زبان مخلوق کی تمام ذمہ داریاں طلعت آرا پر ہی تھیں اور بہت خوش اسلوبی سے اسے انجام بھی دے رہی تھیں۔ شوہر کی خدمت وہ اب بھلے نہ کر پاتی ہوں، پر جانوروں کے معاملات میں کوتاہی نہیں ہو پاتی۔ حالاں کہ غلطیوں پر انہیں بھی

ڈانٹ پڑتی پر وہ انہیں کے آگے پیچھے منڈراتے رہتے۔ بلی تو ہمہ وقت ان کے پہلو میں دبکی رہتی۔ ان کے بستر تک صرف اس کی یا خرگوش کی رسائی تھی اگرچہ دونوں میں ذرا بھی نہیں بنتی تھی۔ خرگوش تو بے چارہ بے ضرر سا جانور تھا۔ حملہ یا احتجاج اس کی سرشت میں نہیں تھا۔ بلی کو جانے کیوں اس سے خدا واسطے کا بیر تھا۔ اکیلے پا کر اکثر اس پر غراتی۔ دبّو خرگوش تیزی سے کسی کونے میں سرک جاتا۔ خرگوش کے مقابلہ بلی زیادہ سمجھدار ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں حسیت زیادہ ہوتی ہے اس لیے جلن و حسد کے جراثیم بھی خرگوش سے زیادہ ہی ہوتے ہیں۔ خرگوش سے بغض و عناد کی وجہ شاید اس کا زیادہ سفید ہونا بھی ہو، پر اس کو دیکھ کر آنکھیں ترینا یا بعض اوقات حملہ آور ہونا اس کے سیدھے پن کی وجہ سے تھا۔ اکیلے پا کر کئی بار وہ پنجے مار چکی تھی تب ہی سے وہ زیادہ خوفزدہ تھا۔ وہ بلی سے ایک مستقل دوری بنائے رکھتا۔ ضیا اور جانوروں کے مقابلہ خرگوش پر زیادہ مہربان تھے اس لیے وہ بیشتر انہیں کے آگے پیچھے لگا رہتا۔

طوطے میاں جنھیں یہاں بھی مٹھو ہی کہا جاتا ہے، صبح سے ٹائیں..... ٹائیں کر گردان نہ لگائے تو اس کے طوطا پن پر حرف آتا ہے لہٰذا وہ ہمہ وقت چیختا رہتا ہے۔ آواز بھی بہت ٹنا کے کی تھی۔ لفظوں کو دہرانا اس کی عادت ہے۔ اسی وجہ سے کچھ گالیاں بھی یاد ہو گئی تھیں۔ حالاں کہ یہ خوغیر کی صحبت میں بھی پڑتی ہے پر یہاں طلعت آرا کے منہ سے سن کر یاد کر لی تھیں۔ جو وقت بے وقت وہ کسی کو بھی سنایا کرتا۔ گو کہ وہ بہت برہم ہوتیں، تنبیہ بھی کرتیں لیکن کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کچھ وقت تک تو اثر رہتا مگر مستقل طور پر وہ طوطا چشمی سے باز نہیں آتا۔

ان سب کو گھر میں پناہ دینے کے لیے چودھری ضیا نے کوئی اقدام نہیں کیا تھا مگر کوئی چیز جب گھر میں ہوتی ہے تو اُنس پیدا ہو جانا بڑا فطری ہے۔ پھر یہ تو جاندار تھے۔ ضیا کو

بھی ان سے خاصا لگاؤ تھا۔ تھوڑی بہت دیکھ بھال بھی کر لیتے۔ اوروں کے مقابلے خرگوش پر نظرِ عنایت کچھ زیادہ تھی۔ چودھری ضیا اپنی زندگی پر مختلف زاویوں سے غور کرتے ہیں۔ عجیب طرح کی باتیں بھی ذہن میں آتی ہیں کہ سوچنا ایک فطری عمل ہے۔ مسئلہ یہاں آ کر الجھتا ہے کہ انہوں نے کیا پایا اور کیا نہیں۔ اطمینان اور بے اطمینانی کے درمیان معلق خالی وقتوں میں اکثر کتابِ زیست کے اوراق الٹتے۔ کاش کسی ایسے گھر میں پیدا ہوئے ہوتے جہاں تعلیم کو اہمیت دی جاتی ہے تو شاید خاطر خواہ تعلیم حاصل کر لی ہوتی اور کسی دفتر میں افسر بن گئے ہوتے۔ اپنی ایک شناخت ہوتی۔ پرانی فائلوں میں ان کے دستخط کتنے دنوں تک باقی رہتے۔ جہاں جاتے لوگ احترام کی نظر سے دیکھتے۔ اس تعظیم کا فرق الگ ہوتا ہے۔ یہ نہ ہوسکا تو کاروبار میں ہی صورت حال اس کے برعکس ممکن تھی۔ تجارتی دنیا میں بھی کیا کر لیے گو کہ صبر و شکر والے آدمی تھے پر خیال آتا کہ طرزِ زندگی کچھ اور ہونی چاہیے۔

اہلِ محلّہ اور خاندان بھر کے لوگ انہیں دیندار بھی سمجھتے تھے مگر یہاں بھی وہ خود کو مطمئن نہیں پاتے۔ نماز روزے کی تو بس عادت سی پڑی ہوئی تھی۔ ایسی ڈگا مار نمازیں تو کروڑوں لوگ پڑھتے ہیں۔ اپنی ہی نظر میں جب قابلِ اعتبار نہیں تھیں تو بارگاہ خداوندی میں کہاں گردانی جاتیں۔ باعمل لوگ کیسے ہوتے ہیں انہیں معلوم تھا۔ یہ خانہ بھی اپنے رنگ سے خالی رہا۔

مرنے سے انہیں ڈر نہیں لگتا مگر موت کی ہیبت سے بہت خوفزدہ رہتے۔ سڑک پر ہوتے تو یہ ڈر ستاتا کہ کوئی گاڑی ٹکر نہ مار دے، یا کہیں آس پاس ہی کوئی بم نہ پھٹ جائے۔ کوئی گولی کہیں سے نکلے اور انہیں ڈھیر کر دے۔ مبادا کوئی درخت یا بجلی کا تار ہی گر پڑے۔ گھر کے باہر کوشش بھر احتیاط برتتے، پھر بھی دھڑکا لگا رہتا۔ انہوں نے کسی کا حق نہیں مارا۔ ان پر جس کا حق تھا وہ ادا کر دیا۔ غصہ، گرمی مزاج میں نہیں تھی۔ کوئی بات ناگوار بھی لگتی تو

سامنے والے کو پتا ہی نہیں چلتا۔ بڑے تو بڑے چھوٹوں تک سے اتنے انکسار سے پیش آتے کہ بیوی کے طعنے سننے پڑے۔ ’’کچھ...... تو...... اپنا وقار...... رکھیے......‘‘ لیکن وہ خود کو نہیں بدل پائے۔ شادی کا واقعہ بھی کچھ کم دلچسپ نہیں تھا۔ اٹھارہ انیس برس کی عمر تھی وہ گھر میں لیٹے ہوئے تھے۔ ابا آئے۔ ’’آج...... تمہارا نکاح ہے۔ حامد میاں کی دختر نیک اختر ہیں۔ میں نے زبان دے دی ہے۔ تمہیں تو کوئی اعتراض نہیں۔‘‘ کچھ سوچنے سمجھنے کی مہلت ہی کہاں تھی اور ہوتی بھی تو ابا کے سامنے اپنے آپ نکل گیا۔ ’’نہیں جیسا آپ بہتر سمجھیں۔‘‘

’’ٹھیک ہے عشا بعد مسجد میں ہی نکاح ہوگا۔‘‘ اور وہ چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد جب ہوش و حواس درست ہوئے تو خیال آیا کہ کیا عشا بعد بھی میری ہاں کی ضرورت پڑے گی؟ اماں سے پوچھ بھی لیا تھا کہ کیا نکاح میں مجھے بھی ہاں کرنی ہے۔ ’’تو...... اور...... کیا...... تمہارے ایجاب و قبول کے بغیر نکاح کیسے ہوسکتا ہے۔ اپنی لاچاری پر وہ آج بھی زیرِ لب مسکرا دیتے ہیں۔ طلعت آرا جب بھی انہیں بے نقط سناتی ہیں تو ان کی مسکراہٹ اور بھی معنیٰ خیز ہو جاتی ہے۔

پہلے سگریٹ نوشی کا شوق تھا جسے کچھ ہی دنوں میں بیگم نے ترک کروا دیا پھر پان کا شوق لگا، وہ بھی انہیں راس نہیں آیا۔ اب شادی بیاہ میں میٹھا قمام والا پان کھا لیتے اور بیوی کے سامنے سینہ تان کر آتے۔ میٹھا پان چوں کہ بیگم کو بھی پسند تھا اسی لیے گاہے بہ گاہے یہ شوق پورا ہو جاتا۔ وہ اکثر یہ طعنہ بھی دیتیں کہ میرے تو کرم پھوٹ گئے تھے جو ابو نے تمہارے حوالے کر دیا ورنہ تمہیں پوچھتا کون؟‘ یہ جملہ کچھ زیادہ ہی چبھتا تھا۔ گہرے آدمی تھے ورنہ کئی بار تو نام زبان پر آتے آتے رہ گیا، بعد میں اپنے فیصلہ پر خود ہی خوش ہوتے۔ اگر کبھی دھوکے سے بھی رقیہ کا نام لے لیا ہوتا تو ان کے ساتھ جو ہوتا سو ہوتا، رقیہ کی بھی خیریت نہ

www.urduchannel.in

رہتی۔

تقریباً 35 برس پہلے آنکھوں میں چھپائے کچھ راز آج بھی رقیہ سامنے آتی ہے تو منکشف ہوجاتے ہیں۔ایک بار اس نے کہا تھا ''اللہ پاک کی قسم کسی کو نہیں بتایا اور کبھی بتاؤں گا بھی نہیں۔یہ راز میرے ساتھ ہی دفن ہوگا۔'' ہمارے زمانے کی محبتیں بھی کیسی ہوا کرتی تھیں۔بال بچوں اور گھر گرہستی میں پھنسی وہ کبھی کہیں ملتی ہے تو اب بھی آنکھوں میں وہی جگنو چمکتے سے نظر آتے ہیں۔اس کے بارے میں ہم نے پھر کبھی کوئی بات نہیں کی۔ایسی خبریں تو طیور کی زبانی بھی دوسروں تک پہنچ جاتی ہیں پر ضیا کو یقین تھا کہ تیسرے کسی کو بھی علم نہیں۔ناشتے کی خبر پر ذہن منتشر ہوا۔دکان جانے کا وقت ہوگیا تھا۔اخبار رکھ کر وہ ڈائننگ ٹیبل کی طرف بڑھے۔صاحبزادے کو بھی آواز دی۔اسی وقت بلی کمرے سے نکلی۔دانتوں میں ایک چوہا دبا ہوا تھا۔''اوہ..... تو یہ ہے جو رات میں پریشان کیے ہوئے تھے''۔چوہے سے اب ہمدردی ہو رہی تھی مگر وہ اب اس دنیا میں نہیں تھا۔

شام کو دکان سے گھر آئے تو ایک شخص اور ساتھ میں تھا۔کمرے میں بٹھا کر بیگم کو صورت حال سے آگاہ کیا کہ ''بچپن کا دوست ہے۔بیرون میں رہتا ہے۔آج بہت سالوں بعد ملاقات ہوئی تو ساتھ لے کر آیا۔کھانا ساتھ ہی کھائیں گے۔'' آخری جملہ سنتے ہی بیگم کی تیوریاں چڑھ گئیں۔یہ کوئی طریقہ ہے۔جب جسے چاہا ساتھ لے کر آگئے۔لانا تھا تو پہلے سے خبر کر دی ہوتی.....اور بھی جانے کیا۔آئیں.....بائیں.....شائیں۔اس بات کا لحاظ ضرور رکھا کہ آواز کمرے تک نہ جائے۔ضیا کو اس بات سے راحت ملی۔وہ وہاں سے ہٹ گئے۔انہیں معلوم تھا کہ وہ بڑبڑائے گی تو بہت مگر انتظام کر لے گی بلکہ اہتمام کے ساتھ۔لگتا ہے زبان کسی اور کی لگی ہو،اسی وجہ سے زیادہ تر لوگوں کی بری ہے۔ہر ہر طرح سے سمجھایا مگر مجال کہ وہ غصہ اور زبان پر قابو رکھ پائے۔حالاں کہ اَب پہلے سے کافی تبدیلی

آ گئی ہے۔پہلے تو چیزیں اٹھا اٹھا کر پھینکتی تھی۔جہیز کی زیادہ تر کراکری اسی طرح توڑی ہے۔خود کو جسمانی اذیت دیتی تھی۔کہیں دیوار سے سر مار لیا۔کہیں چوڑیاں توڑ کر کلائی میں خرونچیں لگا لیں۔ضیا تو کانپنے لگتے تھے۔وہ ذرا ایسا بیٹھا تھا کہ اب تک نہیں نکلا ہر چند کہ یہ تماشے کب کے ختم ہو چکے۔ایک بات پر وہ بہت حیرت کرتے تھے کہ اتنا لعن طعن کرنے کے بعد اس نے انہیں جسمانی چوٹ نہیں پہنچائی۔شاید یہی وجہ تھی کہ اتنے برس بعد وہ دونوں ایک چھت کے نیچے رہ رہے تھے۔

اتوار کا دن تھا،آج دکان بھی بند تھی۔سب لوگ ساتھ میں بیٹھے تھے۔بڑا خوشگوار ماحول تھا۔طوطا بھی ٹائیں ٹائیں کر رہا تھا۔بلی طلعت آرا کے پہلو میں دبکی ہوئی تھی۔خرگوش کہاں ہے؟ چودھری ضیا نے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ کمرے میں ہے اور اب مٹھو کی آواز سے بھی ڈرتا ہے۔باقی لوگ ہنس رہے تھے۔ضیا خاموشی سے اٹھے اور کمرے میں جا کر اسے ہاتھ میں اٹھا کر لائے۔دوسرے ہاتھ سے سہلاتے رہے۔بیٹھنے سے پہلے انہوں نے طوطے کو گھور کر دیکھا جیسے کچھ تنبیہ کر رہے ہوں۔چند لمحوں تک سب ٹھیک رہا پھر طوطے کی کرخت آواز گونجی۔خرگوش نے ایک جست لگایا اور پھر اسی کمرے میں جا گھسا۔ایک ساتھ سب کے قہقہے بلند ہوئے۔سب سے تیز آواز اُن کی بیوی کی تھی۔وہ سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ اس وقت ان کے چہرے پر کون سے تاثرات ہیں اور کون سے ہونے چاہیے۔وہ پھر ایک بار خاموشی سے اٹھے اور اسی کمرے کی طرف بڑھ گئے۔در و بام سے ہنسی کی آوازیں ٹکرا کر لوٹ رہی تھیں۔

(ماہنامہ 'آجکل' نئی دہلی۔دسمبر 2010ء)

❁❁❁

www.urduchannel.in

بڑا گھر

''کس کا فون تھا؟'' موبائل آف کرتے ہی بیوی نے سوال کیا۔

''مسعود کا۔'' میں نے اطمینان سے جواب دیا۔

''کون.....مسعود؟''

''بڑے ماموں.....والا۔''

''خیریت.....تو.....؟ آج.....کیسے؟'' اس بار دو سوال ایک ساتھ ہوئے۔

سبزی کاٹتے ہوئے ٹھہر کر بیگم نے میرا بغور جائزہ بھی لیا۔

''دراصل مسعود پرانے والے گھر میں تراویح سنا رہا ہے۔ کل اس کا ختم ہے۔ اسی میں شرکت کے لیے فون کیا تھا۔''

''صرف آپ کو کہا ہے؟'' میری بات پوری ہونے سے پہلے ایک اور سوال۔

''نہیں.....بھئی.....سب کو کہا ہے۔ باقاعدہ دیگ چڑھے گی۔'' میرا خیال تھا کہ اس جواب کے بعد اس کا تجسس کسی حد تک ختم ہو جائے گا اور ایسا ہوا بھی۔ اب اس کی

ساری توجہ سبزی کاٹنے پر تھی۔ اس کے کانوں میں پرانے گھر کا ذکر بھی آیا مگر چوں کہ اس کی کوئی وابستگی اس گھر سے نہیں رہی ہے اس لیے اس کا کوئی مسئلہ بھی نہیں بنا جب کہ جواب دینے کے دوران بھی میں اسی پرانے گھر میں الجھا ہوا تھا ہر چند کہ مسعود نے بتایا تھا کہ دادا کا گھر اتنے برسوں سے بند پڑا ہے تو سوچا کہ اس بار تراویح وہیں سناؤں۔ صفائی وغیرہ بھی ہو جائے گی اور ایک بار پھر لوگ جمع ہو جائیں گے۔ یقیناً مسعود کا خیال بہت نیک تھا۔ وہ اس گھر میں مجھ سے کہیں زیادہ رہا ہے۔ ڈھیروں یادیں اس کے ذہن میں بھی ہوں گی۔ مسعود مجھ سے بہت زیادہ چھوٹا نہیں ہے۔ اس پرانے گھر سے جو مسعود کے دادا کا گھر تھا اور میرا ننہال۔ اگرچہ اور بھی بہت لوگوں کا تعلق رہا ہے، پر شاید میری کیفیت ان سب سے مختلف ہے۔ مسعود سے بھی الگ۔ مسعود کو قرآن کتنا اچھا حفظ ہے یا اس کی قرأت کتنی عمدہ ہے، فون پر گفتگو کے بعد مجھے غور تو اس پر کرنا چاہیے تھا اور مجھے اس بات کا احساس بھی تھا کہ یہ تارِ عنکبوت توڑ کر میں باہر نہیں نکل سکتا۔ زندگی کے آئینہ پر وقت کی گرد صاف ہوتی سی نظر آئی۔ ماضی کے کمپیوٹر پر پرانا گھر پاس ورڈ (Password) کی طرح پڑا اور کیا کچھ Explore ہو گیا۔

میں اپنے کمرے میں آ گیا تھا جہاں اس وقت میرے علاوہ دوسرا کوئی نہیں تھا۔ میں آرام دہ کرسی پر ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ جیسے کسی فلم کا فلیش بیک (Flash back) شروع ہونے والا ہو۔ بہت سی چیزیں گڈمڈ ہو رہی تھیں۔ مسعود کو کیا معلوم کہ اس نے مجھے کن مشکلات میں ڈال دیا ہے۔

یہ پرانا گھر آج بھی میرے ذہن میں اسی طرح آباد ہے گو کہ گزشتہ بیس برس سے اس میں کوئی نہیں رہتا۔ در، محرابوں والا بہت بڑا سا گھر۔ کچھ حصے میں لکھوری اینٹیں بھی استعمال ہوئی تھیں۔ بہت ساری طاقیں تھیں۔ ان پر چراغ، لال ٹین وغیرہ رکھی جاتی تھیں

www.urduchannel.in

جو بجلی کے نہ ہونے پر روشن کی جائیں۔ اس وقت میں بہت چھوٹا تھا، پر طاقوں کے اوپر کی سیاہی مجھے اب تک یاد ہے۔

چیزیں ذہن میں کچھ زیادہ ہی منتشر تھیں۔ میں جو کچھ سوچ رہا تھا اگر اس کی کوئی ترتیب ہو یا بیان کرنے کی ضرورت درپیش آئے تو شاید صورت کچھ اس طرح ہو:

دادا کا گھر کچھ فرلانگ پر تھا۔ فرلانگ میں اب تک نہیں جان پایا۔ ٹھیک اسی طرح جیسے گھڑیال اور مگرمچھ کی تشخیص میرے لیے مشکل ہے۔ میرے حساب سے دونوں گھروں کے درمیان نصف کلومیٹر کا فاصلہ تھا مگر یہ تب تھا جب ہم بڑے گھر سے ہو کر جاتے تھے ورنہ سڑک کی طرف سے جانے پر دوگنا چلنا پڑتا تھا۔ بڑے گھر کو لوگ کٹگھرا بھی کہتے تھے۔ یہ نام کیوں پڑا، یہ جاننے کی نہ کبھی خواہش ہوئی اور نہ دلچسپی۔ میری نظر میں تو نانا کا گھر ہی بڑا گھر تھا۔ مجھے یاد ہے کہ کٹگھرا ایک بہت ہی خوفناک راستا تھا۔ دراصل یہ راستا ایک بہت پرانی حویلی کے تہہ خانے سے نکلا تھا۔ اس زمانے میں حویلی کا بیشتر حصہ غیر آباد تھا۔ دن کے وقت بھی اتنا اندھیرا رہتا تھا کہ کچھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ اس وقت صرف آسیب کا ہی ڈر تھا۔ بھوتوں سے متعلق اتنی کہانیاں سن رکھی تھیں کہ کچھ شبہات تو اب تک دور نہیں ہو سکے۔ تاریکی کا یہ سفر حالاں کہ بہت طویل نہیں تھا، پر تھرتھری چھوٹ جاتی تھی۔ اس تاریکی میں کبھی کسی طرح کا حادثہ سننے کو نہیں ملا۔

مجھے یاد نہیں کہ بچپن میں کبھی میں اس راہ سے تنہا گزرا ہوں۔ میں تو خیر بچہ ہی تھا، بڑے بھی گریز کرتے تھے، دو تین لوگ ہوتے تو سب ایک دوسرے کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑے رہتے اور جس کو جو دعائیں یاد تھیں، زور زور سے پڑھتے رہتے۔ راستہ چوں کہ پیچ دار تھا۔ مجھے خوب اچھی طرح یاد ہے کہ وہاں پر تین موڑ تھے۔ یہ اندازہ ہو چکا تھا کہ پہلا موڑ کتنے قدموں کے بعد آئے گا۔ کنارے والے کی ذمہ داری ہوتی کہ وہ دیوار ٹٹولے۔ فصیل

پر ہاتھ پڑتے ہی ایک نامعلوم سی ہمت پیدا ہو جاتی۔ چوں کہ باقی کے ہاتھ ایک دوسرے سے جڑے ہوتے اس لیے یہ ہمت ان لوگوں میں بھی منتقل ہو جاتی۔ تیسرے موڑ تک آتے آتے روشنی کی کرنیں نظر آنے لگتیں۔ گلی کے آخری سرے پر چھن کر آتی ہوئی روشنی ہم لوگوں کے چہروں کی روشنی سے کچھ کم ہی ہوتی۔ اس آخری موڑ سے نکل کر فتح کا ایسا احساس ہوتا کہ ہم لوگ ایک دم سے چلّانا شروع کر دیتے بلکہ وہاں سے دوڑ کا مقابلہ شروع ہو جاتا جو نانا کے گھر پر ہی آ کر ختم ہوتا۔ ہم لوگ بری طرح ہانپ رہے ہوتے۔ بڑی ممانی سب کو ڈانٹتیں۔ اس وقت بڑے دوسروں کے بچوں کو باقاعدہ ڈانٹتے تھے۔ ضرورت پڑنے پر پٹائی بھی کر سکتے تھے۔ بڑی ممانی کی ڈانٹ میں بھی اتنی محبت اور شفقت ہوتی کہ ہم لوگ کوئی اثر نہیں لیتے۔ رشتوں میں ایسا خلوص تھا کہ خود نہ دیکھا ہو تو یقین بھی نہ آئے۔

بڑے گھر کی تاریک فضا اور اس سے پیدا ہونے والی پراسراریت ہم لوگوں کے جوان ہونے تک ایک پہیلی بنی رہی۔ جب تک وہاں سے گزر ہوتا رہا اندھیرا بدستور قائم رہا۔ خوف و ہراس میں کچھ کمی بھی آئی، پر بے خطر کبھی اس گلی سے گزر نہ ہوا۔ اتنے سادہ لوگ ہوا کرتے تھے کہ ایک بتی جلانے کا خیال بھی کسی کے ذہن میں نہیں آیا۔ اب غور کرتا ہوں تو لگتا ہے کہ بتی کی ضرورت کسی کو تھی ہی نہیں۔ کسی کو کسی سے ڈر نہیں لگتا تھا۔

بھشتی تمام راستوں پر مشک سے پانی چھڑکتا۔ مٹی کی اسی خوشبو سے واقف ہوں۔ مسئلہ یہ ہے کہ وہ ابھی تک ذہن میں تازہ ہے۔ ایک پرانے شہر کی گھنی مسلم آبادی والا محلّہ تھا۔ نانا کا گھر تو میرے اعتبار سے بہت پرانا تھا مگر جب تک نانا زندہ تھے اسے پرانا گھر بھی کوئی نہیں کہتا تھا۔ چھوٹے ماموں تو نانا کی زندگی میں ہی دوسرے گھر میں چلے گئے تھے لیکن بڑے ماموں نے یہ فیصلہ اپنے والد کے انتقال کے بعد ہی لیا۔ یہ گھر وہ شاید تب بھی نہ چھوڑتے، پر بڑی ممانی کو اپنے والد کی جائیداد میں ایک مکان میسر آ گیا تھا۔ یہ گھر نیا ہونے

www.urduchannel.in

کے ساتھ زیادہ بڑا بھی تھا۔ اب چوں کہ بچوں کی شادیاں بھی زیادہ دور نہ تھیں اسی لیے اتفاقِ رائے سے فیصلہ ہوا اور اس پرانے بڑے گھر میں تالا ڈال دیا گیا۔

نانا کے گھر کا رقبہ کتنا تھا یہ مجھے نہیں معلوم مگر یہ ایک کشادہ اور خاصا بڑا گھر تھا۔ اتنے مکینوں کے باوجود کبھی جگہ کی تنگی کا احساس نہیں ہوا۔ گھر میں آنے جانے کے لیے دونوں سروں پر دروازے تھے۔ بائیں طرف والا دروازہ بیٹھک میں کھلتا تھا اس لیے بیشتر بند ہی رہتا۔ آمد و رفت کے لیے دائیں طرف والا ہی کھلا رہتا۔ اس میں بھی دروازے تھے ۔ پہلا والا شیشم کی لکڑی کا بھاری بھرکم اور نقش و نگار سے آراستہ تھا۔ ستاروں کی شکل میں پیتل کاٹ کر دونوں پلوں میں کیل سے ٹھونکے گئے تھے ۔ غالباً اڑتالیس ستارے تھے۔ چوکھٹ کے نیچے کا حصہ زمین سے ابھرا ہوا تھا اور نیچے کی کنڈی کا ہک اسی میں لگا ہوا تھا۔ یہ دروازہ رات میں بھی بند نہیں ہوتا تھا۔ شاید اسی وجہ سے جام ہو گیا تھا۔ اس وقت کسی سے ہلائے نہیں ہلتا تھا۔ دوسرے دروازے سے اس کی دوری تقریباً چار فٹ تھی اور یہ خالی حصہ اسکوائر میں تھا۔ زمین سے چھوتا ہوا پردہ دوسرے ہی دروازے پر پڑا تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی بائیں جانب کو بیت الخلا تھا۔ اس کے برابر میں غسل خانہ۔ غسل خانے کی ایک دیوار بیٹھک سے ملحق تھی جس کے لیے باہر سے دوسرا راستا تھا۔ ایک کشادہ صحن تھا۔ ورانڈے اور صحن کے بیچ میں دو محرابیں تھیں۔ ان محرابوں میں آگے پیچھے دو دو طاقتیں تھیں۔ بڑی ممانی ورانڈے کو دالان کہتیں۔ دائیں طرف کونے میں باورچی خانہ۔

پہلے باورچی خانے باقاعدہ اور اس اہتمام سے نہیں بنتے تھے۔ جس جگہ ہنڈیا پکتی تھی وہ باورچی خانہ ہو جاتا تھا۔ مٹی کا چولہا تھا۔ برادے کی دو انگیٹھیاں بھی تھیں۔ المونیم کے بھگونے، پتیلیاں، تام چینی کی رکابیاں، اس وقت کراکری تو ایسی ہی ہوتی تھی مگر کھانے کا جو ذائقہ تھا جس نے نہ کھایا ہو وہ اندازہ بھی نہیں لگا سکتا۔

دوپہر کے کھانے سے فارغ ہوتے ہی شام کے لیے گوشت چڑھا دیا جاتا۔ چولہا جلانے کے لیے تانبے کے بڑے سے چمچ میں آگ آس پڑوس سے مانگی جاتی۔ بعد میں کئی لوگ یہاں بھی آگ لینے آتے۔ یہ ایک عام رواج تھا اور اس وقت تک ہم لوگ اتنے تعلیم یافتہ بھی نہیں ہوئے تھے کہ اسے معیوب سمجھتے۔ دو کمرے ورانڈے کے عقب میں تھے جو چھوٹے بڑے ماموں کی تحویل میں تھے۔

میں نے اپنی نانی کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ امی کی شادی سے پہلے اس دنیا سے رخصت ہو چکی تھیں۔ نانی کی تصویر البتہ میں نے دیکھی تھی۔ نانا کو چھوڑ کر اُن کے کنبے کی ایک اکیلی اجتماعی تصویر جو اَب تک میرے پاس فریم میں موجود تھی۔ وقت کے ساتھ بعض تصویروں کی بھی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ اتنا طویل عرصہ گزر گیا مگر لگتا ہے جیسے ابھی کل کی سی بات ہے، بہت کچھ آنکھوں سے دیکھ کر بھی جیسے یقین نہیں ہوتا۔ نانی کی تصویر اس گروپ میں یوں بھی نہیں تھی کیوں کہ وہ عملاً بہت مذہبی قسم کے آدمی تھے۔ سنا تھا کہ حج پر جانے کے لیے پاسپورٹ بنوانے کی خاطر ایک بار بہت سمجھانے بجھانے کے بعد فوٹو کھنچوائی تھی۔ وہ تصویر بھی گھر میں کسی کو دیکھنے کو نہیں ملی۔

نانا دنیا و مافیہا سے بے خبر صرف دین کے لیے دین پر زندہ رہے۔ سرخ و سپید رنگت تھی۔ بہت گھنی سفید داڑھی۔ کسی اور موضوع میں انہیں قطعی دلچسپی نہیں تھی۔ کبھی جب گفتگو ناگزیر ہو جاتی تو ہاں، ہوں سے کام چلاتے۔ سامنے والے کو اندازہ ہو جاتا کہ انہیں وحشت سی ہو رہی ہے۔ ذکر و اذکار اور عبادت کا سلسلہ رات میں بھی ختم نہیں ہوتا۔ وہ بہت کم سوتے تھے۔ عشا اور تہجد کے درمیان بھی اٹھ جاتے۔ نمازیں پڑھتے، تلاوت کرتے، نوے برس کی عمر پائی تھی۔ آخری وقت تک انہیں چشمے کی ضرورت نہیں پڑی۔ سرمہ البتہ باقاعدگی سے لگاتے تھے۔ امی بتاتی ہیں کہ انہوں نے بھی اپنے بچپن سے اسی طرح عبادت میں

www.urduchannel.in

مشغول پایا ہے۔نانا کی شخصیت کو سمجھنے کے لیے میں اس وقت بہت چھوٹا تھا لیکن اب پچاس برس کا ہونے پر کافی کچھ دیکھا ہے۔شخصی طور پر بھی بڑے عجیب لوگوں سے سابقہ پڑا۔ معاشرتی طور پر پورا منظر نامہ تبدیل ہوتے ہوئے دیکھا۔دیندار لوگوں کی بھی قربت رہی، پر نانا حاجی ظہور جیسے پرہیزگار کم ہی دیکھے۔ایک الگ طرح کی چمک اُن کے چہرے پر ہوتی تھی۔لوگ اسے نور ہی کہتے۔

نانا کا کنبہ تین بیٹوں اور اتنی ہی دختران پر مشتمل تھا۔منجھلے بیٹے یعنی میرے ماموں کا انتقال بہت پہلے ہو چکا تھا۔وہ میری اوائل عمری کا زمانہ تھا مگر مجھے کافی کچھ یاد ہے۔نانا نے اپنے بچوں کی تعلیم پر بہت توجہ کی تھی۔اس وقت لڑکیوں کو زیادہ پڑھانا ایک طرح کا عیب سمجھا جاتا تھا۔اس کے باوجود نانا نے اپنی بیٹیوں کو بہتر تعلیم دلوائی۔

چھوٹے ماموں کے پانچ اور بڑے ماموں کے چھ بچے ملا کر کل سترہ لوگ اس گھر میں مستقل رہنے والوں میں تھے۔مہمانداری بھی بہت تھی۔آئے دن ہم لوگ بھی ڈیرا ڈالے رہتے۔دادا کے گھر سے نکل کر دوسری جگہ رہنے تو لگے تھے پر وہاں کسی کا دل نہیں لگتا۔ دن میں بھی اس قدر سناٹا رہتا کہ بعض اوقات ڈر سا لگنے لگتا۔ہم لوگ ابھی اس طرح کے ماحول کے عادی نہیں ہوئے تھے۔بہانے کے بغیر بھی آئے دن نانا کے یہاں آدھمکتے۔ خالائیں بھی اپنے بچوں سمیت آجاتیں۔ہم میں سے بیشتر کی نعل وہاں گڑی تھی۔شاید اس گھر سے والہانہ لگاؤ اسی وجہ سے تھا۔سب کو اس گھر میں لطف آتا۔اس کی کئی وجوہات تھیں ۔پہلی یہ کہ یہاں اپنی عمر کے کافی لوگ تھے۔شرارت کرنے پر بھی یہاں ڈانٹ نہیں پڑتی۔ تیسرے یہ کہ کھانے پینے کی فروانی کے ساتھ ہر مال چھاننے کو ملتا۔بڑی ممانی کو دیکھ کر اکثر یہی لگتا کہ ان کی شادی جیسے باورچی خانے سے ہوئی ہے۔وہاں سے نکلنے کا نام ہی نہ لیتیں، کسی کو کھلانے میں اتنا مزا آتا ہے، یہ تجربہ پہلی بار بڑی ممانی کو دیکھ کر ہی ہوا۔حلال روزی

کی خیر و برکت کے بارے میں پہلی بار اس گھر میں سنا تھا بلکہ محسوس بھی کیا تھا لیکن بعد میں جب حرام کی نحوست دیکھی تو فرق واضح ہوا۔

بڑی ممانی کے ہاتھ میں جیسے جادو تھا کہ جو ہنڈیا پکاتیں، لوگ انگلیاں چاٹتے رہ جاتے۔گوشت کی کتنی قسمیں انہیں معلوم تھی، آج کی لڑکیوں کو تو نام تک نہیں معلوم۔دال سبزی کا رواج بہت کم تھا۔گوشت بھی بڑے کا ہی پکتا تھا پر ایسا پکتا تھا کہ.....۔

اب ہمارے گھر میں بڑے کا گوشت نہیں پکتا۔ظاہر ہے اس کی وجہ میرے بچے ہیں اور بچوں کے نہ کھانے کا سبب ان کا Status ہے، جانے کیوں جی چاہتا ہے یہاں قہقہہ مار کر ہنسوں مگر گھر میں تھوڑا بہت Status تو میرا بھی ہے۔جہاں بے تکلفی سے تیز آواز میں بات کرنا ممنوع ہو وہاں قہقہہ لگا کر ہنسنا.....؟؟؟

سورج کا طلوع و غروب پہلے بھی ایسا ہی تھا۔موسم کے تغیرات میں البتہ کچھ تبدیلی آئی ہے مگر بنی نوع آدم وہ ہرگز نہیں ہے جو پہلے ہوا کرتا تھا۔انسان میں آئی ہوئی تبدیلیاں حیرت انگیز ہیں لیکن حیرت کا باعث سب کے لیے نہیں ہے۔پرانی قدروں کے لوگ ہی افسردہ و آزردہ ہوتے ہیں۔نئی نسل کو ان باتوں میں نہ کوئی دلچسپی ہے اور نہ اس کے پاس وقت۔اس نے اس سے فرار کے لیے ایک لفظ گڑھ لیا ہے کہ ہم بہت Practical ہیں۔جذباتیت سے ہمارا کوئی لینا دینا نہیں۔بھولے بھٹکے کبھی کہیں اپنی تہذیب و اقدار کے جال میں الجھے کسی شخص سے ملاقات ہوتی ہے تو دونوں اپنا غم ہلکا کر لیتے ہیں۔میں اکثر سوچتا ہوں کہ سراب میں خود کو پانی کا فریب دینے کا یہ سلسلہ بھی کب تک؟

ہمارے بچپن بلکہ بالغ ہونے کے بعد تک خاندانی منصوبہ بندی کا چلن اتنا عام نہیں ہوا تھا۔ذرائع محدود تھے مگر لوگ واقف تھے۔اس کے باوجود لوگ پسند نہیں کرتے تھے۔مذہبی قدغن تو آج بھی ہے، پر پہلے یہ یقین بھی تھا کہ رزاق اللہ ہی ہے۔اکثر گھروں

میں وافر تعداد میں بچے پیدا ہوتے تھے۔ گھر چھوٹے نہیں ہوتے تھے مگر خوشیوں سے بھرے ہوتے تھے۔ پیسوں کی تنگی کے باوجود زندگی زیادہ پرسکون تھی۔ اب تو وقت کی برکت بھی ختم ہوگئی۔ دن، مہینے، سال ایسے بھاگ رہے ہیں جیسے موٹر سے چل رہے ہوں۔

دادا کے یہاں بھی سب بڑے ہو گئے تھے۔ بچوں کی شادیاں شروع ہوئیں۔ ماشاءاللہ پورے نو تھے۔ تین پھوپھیاں ملا کر کل بارہ۔ تمام بھائی بہنوں میں ابو کا نمبر دوسرا تھا۔ مزاجاً اور بھائیوں سے مختلف تھے۔ بہت سادہ لوح اور قناعت پسند۔ دوسروں کے مقابلے اپنی ذمہ داری زیادہ سمجھتے اور صرف سمجھتے ہی نہیں حتی الامکان تکمیل کی کوشش بھی کرتے۔ کئی چچا اپنے کنبے کو لے کر گھر سے نکل چکے تھے پھر بھی جگہ کی تنگی مشکلات پیدا کر رہی تھی۔ مالی حالات پہلے سے خاصے بہتر ہوئے تھے۔ ابو کو لگا کہ ان کے نکلنے سے اب گھر پر کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا اور آخر کار انہوں نے بھی رخت سفر باندھ لیا۔ اس ماحول سے نکلنے کا اثر بھی ہوسکتا ہے پر والدین کی نیکیاں بھی ضرور شامل تھیں کہ ہم بھائی بہن ضرورت بھر کی تعلیم حاصل کر سکے۔ یہ تو اب پتا چلا ہے کہ نئی تعلیم نے ہماری سوچ کو کس طرح مسخ کیا ہے۔ اب عزت و وقار کے لیے Lifestyle کی ضرورت ہے۔ طرزِ زندگی، نقل مکانی کے ساتھ تبدیل ہونا شروع ہوگئی اور دھیرے دھیرے اس میں اضافہ ہی ہوتا گیا۔ اب گھر میں زیادہ تیل مسالوں والے کھانے نہیں پکتے۔ Fast food کے نام سے نئی خور دونوش دستیاب ہیں۔ ایک ساتھ دسترخوان پر بیٹھ کر کھانے کا رواج بھی تقریباً ختم ہو گیا۔ اب کھانے کے لیے الگ میز کرسیاں ہیں۔ جس کو بھوک لگی، چاؤمین یا کارن فلیکس جیسے ناموں کی چیزیں 'آیا' نے ابال کر میز پر سجا دیں۔ مہنگی کراکری میں کیا ایسے کھانوں کا ذائقہ بڑھ سکتا ہے۔ یہ سوال میں اپنے آپ سے کرتا ہوں۔ بچے تو ایسے کھانوں کے دیوانے تھے۔ سخت سردی میں بھی Cold Drinks فریج میں موجود ہوتی اور بھی جانے کیا.....کیا...

پیٹ بھر کے کھانا کھائے ہوئے مجھے کتنے برس گزر گئے اب یاد بھی نہیں رہتا۔ بڑی ممانی کبھی کبھی زیادہ یاد آتی ہیں۔

Multi Plexes اور Malls کلچر چھوٹے شہروں تک کو اپنی گرفت میں لے چکے تھے۔ حوائج ضروری کے لیے بیت الخلا میں کموڈ نام کی ایک چیز ایستادہ تھی۔ لوگوں کی تاویل ہے کہ بدن، گھٹنوں میں درد کی صورت میں یہ زیادہ بہتر ہے۔ جی چاہتا ہے کہ سوال کروں کہ بدن اور گھٹنوں میں درد ہونے کے اسباب کیا ہیں؟ بہر حال میں چاہ کر بھی کسی سے کچھ نہیں پوچھ پاتا ہوں۔ لوگ میری خاموشی کو اپنی دلیل سے مطمئن ہوجانے پر محمول کرتے۔

بغیر وجہ کے اب ایک دوسرے کے گھر آنے جانے کا رواج بھی ختم ہوگیا تھا۔ شادی بیاہ کی تقریبات یا بیماری، آزاری اور موت پر ہی لوگ ایک دوسرے سے مل پاتے۔ یخ بستہ جذبوں کے ساتھ گرم جوشی کا اظہار کرتے ہوئے چہروں پر مصنوعی مسکراہٹوں کا غازہ پوتے ہوئے۔ بچوں کے درمیان تو یہ فاصلہ عبرتناک حد تک پہنچ گیا تھا۔ وہ آپس میں ایک دوسرے کے نام بھی نہیں جانتے۔ میں نے سنامی کا نام بھی اس سے پہلے نہیں سنا تھا۔

اگلے روز کی شام بھی آ گئی۔ مجھے معلوم تھا کہ بیگم اور بچے وہاں نہیں جائیں گے۔ میں اپنی طرف سے کہنے کا کوئی موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔ میں کچھ زیادہ ہی خوش تھا۔ اکثر سوچتا کہ ایک بار اُس گھر کو دیکھ آؤں۔ بہر حال وہ سبیل آج نکل آئی۔ وقت پر میں اس علاقے میں آ گیا تھا۔ سب کچھ حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ بہت کچھ تبدیل ہوگیا تھا۔ اونچی اور عمدہ عمارتیں تعمیر ہوگئی تھیں، نئی شکلیں دکھائی دے رہی تھیں۔ میں اُن کے لیے اجنبی تھا۔ قدم آگے بڑھاتے ہوئے کچھ لحاظ سا آ رہا تھا کہ اب گھر میری آنکھوں کے سامنے تھا۔ دروازے پر پہنچ کر ٹھہر گیا۔ باہر کا جو حصہ یہاں سے نظر آ رہا تھا، بہت غور سے دیکھا۔

www.urduchannel.in

اندازہ ہوا کہ عمارت خاصی بوسیدہ ہوچکی ہے۔شیشم کے دروازے پر نگاہ ایک دم سے رک گئی۔وہ بالکل اجڑ چکا تھا۔پیتل کے ستارے نوچ لیے گئے تھے۔اس وجہ سے بھی چوبی دروازے کو بہت نقصان پہنچا تھا۔مسعود نے سفیدی کرائی تھی مگر پلاسٹر جگہ جگہ سے ادھڑ جانے کی وجہ سے چمک ماند پڑ گئی تھی۔میں اپنے خیالوں میں گم تھا جس کی وجہ سے مجھے خیال بھی نہ رہا کہ اندر جماعت کھڑی ہوچکی تھی۔میں لپک کر گیا اور نیت باندھ کر کھڑا ہوگیا۔ سلام پھیرنے اور دوبارہ کھڑا ہونے میں اتنا وقت نہیں ملتا کہ گھر کے در و بام پر نظر ڈال سکوں۔ویسے بھی میں بیٹھک والے کمرے میں دوسرے صف میں کھڑا تھا۔

تراویح ختم ہوتے ہی لوگوں کا ہجوم حافظ صاحب کی طرف لپکا۔پانی پھکوانے اور اپنے اوپر بھی پھونک ڈلوانے کی ہوڑ سی لگی تھی۔میں فوراً کمرے سے باہر آ گیا۔اس وقت میرے لیے کچھ اور زیادہ ضروری تھا۔گھر کے ہر کونے کو دیکھ کر میں اس کا لمس محسوس کرنا چاہتا تھا۔بیشتر نمازی حافظ مسعود کی طرف رجوع ہوگئے تھے جس کی وجہ سے بقیہ حصے خالی ہوگئے تھے۔مجھے بھی یہی چاہیے تھا۔میں حیرت زدہ تھا اور اس کی وضاحت میرے چہرے سے بھی نمایاں تھی۔یہ گھر مجھے غیر معمولی طور پر چھوٹا لگ رہا تھا۔مگر یہ کیسے.....ممکن تھا؟ میں نے خود ہی سے سوال کیا لیکن سچ تو میری آنکھوں کے سامنے ہے.....اور یہ قطعی وہم نہیں.....یہ معجزہ بھی نہیں.....خالی مکان تو ویسے بھی بڑا لگتا ہے۔پھر یہ اتنا تنگ کیوں کر ہوگیا؟ یہ دوسرا سوال تھا۔اس سوال کا جواب تلاش کرنا میرے لیے مشکل تھا۔دماغ میں تیز آندھیاں سی چلنے لگیں۔میرے کانوں میں اور لوگوں کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ان میں تحیر تھا۔یہ بالکل الگ اور عجیب طرح کا تجربہ تھا۔اس سے قبل کبھی کسی سے سنا بھی نہیں تھا۔ایک روپے کا سکہ چونی کی شکل میں سامنے تھا۔میں کچھ نہیں سمجھ پا رہا تھا۔عجب سراسیمگی کے عالم میں ادھر سے ادھر ٹہلتا رہا۔تھوڑی دیر بعد مسعود میرے پاس آیا۔معانقہ کے بعد میں نے مبارکباد دی۔

پھونک بھی ڈلوایا.....''مجھے یقین تھا.....کہ آپ.....ضرور.....آئیں گے۔''

''آتا.....کیوں.....نہیں.....؟''زیر لب اپنے آپ میرے منہ سے نکلا۔''کچھ .....دیکھا.....آپ نے.....؟''مسعود نے معنی خیز انداز میں سوال کیا۔

''کیا.....؟''میں نے انجان بننے کی کوشش کی۔

''گھر.....دادا.....کا۔یہ.....اتنا.....بڑا.....گھر.....''

''ہاں.....وہی.....دیکھ.....رہا ہوں۔''رک رک کر میں نے جواب دیا۔

''کوئی گھر اس طرح اتنا چھوٹا کیسے ہوسکتا ہے؟''عجیب طرح کا سوال کر بیٹھا۔ مسعود نے مجھے بتایا کہ قران میں اللہ نے فرمایا ہے کہ''وہ زمینیں.....تنگ بھی کر دیتا ہے۔''میں پھٹی آنکھوں سے مسعود کو دیکھے جا رہا تھا۔یہ اندازہ کرنا کہ یہ ایک گھر زیادہ اجڑا ہے یا میرا چہرہ، میرے لیے شاید ناممکن کام تھا۔

(ماہنامہ'آجکل'نئی دہلی۔فروری2010ء)

❁❁❁

www.urduchannel.in

خوابگینے

صحرائی ہیبت ناکی سے متعلق اس نے بچپن سے اب تک بہت کچھ پڑھا اور سنا تھا لیکن آج جاگتی آنکھوں سے وہ اس ہیبت کو دیکھ رہا تھا۔ کیمرے کی آنکھ سے حالاں کہ وہ یہ مناظر بہت بار دیکھ چکا ہے لیکن براہ راست دیکھنے کی بات اور ہے۔ ویسے تو ٹی وی یا فلم میں کچھ نہیں دیکھا مگر وہ سب غیر یقینی سا تھا۔ اپنی جیتی جاگتی آنکھوں سے دیکھنے کا خواب ہنوز باقی ہے۔

اس وقت وہ اس فرق کو محسوس کر رہا تھا۔ بعض اوقات حادثات اور سانحات کے اثرات ذہن پر فوری طور پر اس طرح اثر انداز نہیں ہوتے جس کا کہ وہ تقاضا کرتے ہیں اور کبھی صورت حال اس کے بالکل برعکس بھی ہو جاتی ہے۔ تیز دھوپ تپتا، جھلستا..... لق .....ودق..... صحرا..... کسی کو کسی قدر خوف زدہ اور حیران کر سکتا ہے۔ یہ اس پر بھی منحصر ہے کہ ہم کتنا خوف زدہ یا حیران ہو سکتے ہیں۔ سورج کے جلال نے ریگزاروں میں آگ بھر دی تھی۔ زمین اتنی گرم بھی ہو سکتی ہے اس کا احساس اسے آج اتنی شدت سے پہلی بار ہوا۔ پاؤں میں جوتے ہونے کے باوجود شاید آبلے ابھر آئے تھے۔ محدود نظر کی جہاں

تک رسائی تھی صرف ریت ہی ریت دکھ رہی تھی۔ گرمی کی شدت نے اور تو اور بگولوں تک کو اپنی جگہ ساکت کر دیا تھا۔ سراب تو خود ایک دھوکہ ہے مگر یہاں وہ فریب نظر بھی غائب تھا۔ بلا کی گرمی، جس سے نجات کے کوئی امکان نظر نہیں آ رہے تھے۔ وہ سوچنے لگا کہ آخر وہ یہاں آیا کیسے؟ کیا وہ راستا بھٹک گیا ہے، کیا اس کے ساتھ کچھ اور لوگ بھی تھے؟ اس طرح کے اور بھی کئی سوالات تھے مگر کسی سوال کا اطمینان بخش جواب اس کے پاس نہیں تھا اور پھر اس نے رونا شروع کر دیا۔ اگر وہ کسی شاہراہ پر ہوتا تو یقیناً لوگ ایک 63 برس کے آدمی کو اس طرح روتے دیکھ کر ٹھہر جاتے، پر اس ویرانے میں یہ بھی ممکن نہ تھا۔ اس کی آہ و بکا سننے والا اس کے علاوہ کوئی اور نہ تھا۔ پہلے وہ خاموشی سے رو رہا تھا پھر اچانک دہاڑیں مارنے لگا اور تبھی اسے ایک آواز سنائی دی۔ معاً اس کا رونا تھم گیا۔ یہ وہم نہیں تھا۔ آواز کسی فون کی گھنٹی تھی۔ اس نے جیب سے فون نکالنے کی کوشش کی لیکن موبائل تو سائڈ ٹیبل پر تھا۔ انگلیوں نے آواز کی روشنی میں فون گرفت میں لے لیا۔ اب تک چشمہ اٹھا کر Caller کا نام بھی اس نے دیکھ لیا تھا اور بٹن دبا کر بولنا شروع کیا۔..... ''ہیلو..... کون''.....؟

''آفاق چچا..... میں مطلوب..... ابا..... کا ابھی انتقال ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون.....۔'' جواب میں اس کی زبان سے بس اتنا ہی نکلا۔

''آتا..... ہوں..... بیٹا.....'' ٹھیک ہے..... اللہ..... حافظ .....اس کے بعد فون پیجامے کی جیب میں رکھتے رکھتے ہاتھ رک گیا۔ کچھ غور و خوض کے بعد فون میز پر رکھ دیا۔ اب تک ہوش و حواس کچھ درست ہو گئے تھے۔ اف..... ایک اور خواب..... خود کلامی کے انداز میں لبوں میں جنبش ہوئی۔ تکیہ پر سر رکھ کر کئی بار آنکھیں جھپکائیں اور پھر پوری طرح کھول دیں۔ اے سی کی وجہ سے کمرہ کچھ زیادہ ہی ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ عام طور سے وہ رات میں کسی وقت آنکھ کھلنے پر اے سی بند کر دیتے تھے مگر کبھی کبھی یہ

www.urduchannel.in

چوک بھی ہو جاتی ۔ذہن میں ڈھیروں خیالات اور ان سے متعلق سوالات کسی فلمی منظر کی طرح Overlap ہو رہے تھے۔وہ خواب کے بارے میں بھی کچھ غور وفکر کرنا چاہتے تھے مگر بڑے بھائی کی موت کی خبر نے بوسیدہ عمارت کی بچی کھچی ایک دیوار بھی منہدم کر دی۔وہ اپنے اجداد کے چھوڑے ہوئے اخلاقی قدروں کے ملبے تلے دبے ہوئے اکھڑی سانسیں لے رہے تھے۔کون جانے کب یہ تارِ نفس بھی ٹوٹ جائے.....اور.....؟ وہ ایک دم سے ہڑ بڑا کر کھڑے ہو گئے ۔گھڑی دیکھی ۔فجر کا وقت ہو گیا تھا۔حوائج ضروری سے فارغ ہوئے ۔وضو کیا۔جماعت سے نماز پڑھنے میں تاخیر یقینی تھی ،اس لیے جیسے تیسے چار رکعت پڑھیں اور اسکوٹر نکال کر روانہ ہو گئے ۔جلد بازی میں صبح کی دوا بھی بھول گئے ۔دس منٹ میں بھائی کے گھر پہنچ گئے اور کوئی وقت ہوتا تو ٹریفک کی وجہ سے اتنا ہی وقت اور لگتا۔وہاں خاصے لوگ موجود تھے ۔پاس پڑوس کے لوگ ایسے موقع پر رشتے داروں سے سبقت لے جاتے ہیں۔بین کی آوازیں پھاٹک کے باہر تک آ رہی تھیں۔ویسے بھی سناٹے میں آوازیں تیز سنائی دیتی ہیں بلکہ کرخت ہو جاتی ہیں۔بچے ان سے لپٹ کر رونے لگے۔وہ سب کے سروں پر ہاتھ پھیرتے رہے،زبان جیسے تالو سے چپک گئی تھی۔وہ خود نہیں سمجھ پا رہے تھے کہ ایسے وقتوں میں قوت گویائی اگر ساتھ بھی دے تو کیا گفتگو ہو سکتی ہے؟ وہ بہت صبر وتحمل والے آدمی تھے۔اس کے باوجود آنکھیں نم ہو گئیں۔ماضی کے کتنے سارے منظر بجلی کی طرح ذہن میں کوند گئے ۔ان لوگوں کی پیدائش وپرورش کا جو وقت تھا تب آب وہوا اتنی آلودہ نہیں تھی ۔اس دور میں کسی کو کسی ایسی چیز سے محبت نہیں تھی جسے بینک یا لاکر میں رکھنے کی ضرورت پیش آتی ہو۔جیبوں میں پیسوں کی جگہ محبتیں بھری ہوتی تھیں ہر کسی کے لیے..... کسی کی نظر لگ گئی ہے۔ایک لمحہ کو وہ خواب کا منظر پھر سے نظروں کے سامنے ابھر آیا۔انہوں نے فوراً جھٹک دیا۔بھائی کی میت کو دیر تک دیکھتے رہے اور پھر خاموشی سے باہر آ کر کرسی پر بیٹھ

گئے ۔شاید گر پڑنے کا خطرہ لاحق تھا۔

وقت کے ساتھ مجمع میں اضافہ ہوتا گیا۔فضا میں ایک گہری سوگواری کا سا عالم تھا۔رائے مشورے کے بعد تدفین وغیرہ کا اعلان ہو گیا۔کچھ عزیز واقارب گھر سے اتنی دور تھے کہ ان کا آنا ممکن نہ تھا اور پھر وقت مقررہ پر جنازہ گھر سے رخصت ہو گیا۔تعزیت میں آئے لوگوں کی درست تعداد قبرستان میں ہی نظر آئی ۔اکثر لوگ نماز جنازہ میں شرکت کیے بغیر براہ راست قبرستان آ گئے تھے اور ایک دوسرے کے بتا رہے تھے کہ چودھری صاحب بڑے وضع دار اور شریف النفس انسان تھے ۔اسی لیے مٹی میں اتنے لوگ آئے ہیں ۔چودھری صاحب کے ساتھ پچھلے وقتوں کا بہت اثاثہ بھی ساتھ دفن ہو گیا تھا۔چند ثانیوں کے بعد لوگ ہاتھ جھاڑ کر چلے گئے ۔گھر کے لوگ کچھ اور دیر رکے۔فاتحہ پڑھا گیا۔مغفرت کی دعائیں کی گئیں اور پھر وہ بھی باہر نکل گئے ۔

چودھری آفاق امین رات گئے تک گھر میں رکے رہے۔پسماندگان کو تسلی وتشفی دیتے رہے۔لوگ بھوکے پیاسے تھے۔سمجھا بجھا کر انہیں زہر مار کرایا اور خود بھی چند لقمے حلق میں ڈالے اور صبح آنے کا وعدہ کر کے وہ اپنے گھر آ گئے ۔

گھر آ کر سب سے پہلے دوائیں لیں ورنہ طبیعت بگڑنے کے امکان تھے ۔نہا دھو کر وہ بستر پر آ گئے ۔انہیں معلوم تھا کہ صبح سے بہت کچھ یاد آ رہا ہے ۔دن بھر تو ان خیالوں کو جھٹکتے رہے مگر اب وہ خود بھی یاد کرنا چاہتے تھے .....سب ..... کچھ ..... بچپن سے اب تک..... کا..... سفر.....وہ جس مکان میں رہتے ہیں یہ پہلے گھر ہوا کرتا تھا.....بارہ کمروں پر مشتمل۔بڑا سا صحن..... کشادہ برآمدے.....ہر طرف سے ہوا، روشنی کا انتظام تھا۔پہلے یہ گھر دادا کی تحویل میں تھا پھر بڑے ابا سرپرست ہو گئے ۔وقت کے ساتھ بھرے پرے گھر سے لوگ دوسرے ٹھکانوں کی طرف ہجرت کرنے لگے اور

دیکھتے ہی دیکھتے کنبے بکھر گئے۔آخر میں آفاق امین ہی اپنے بیوی بچوں کے ساتھ اس گھر میں اکیلے رہ گئے۔

دباؤان پر بھی بہت ڈالا گیا مگرانہوں نے حتمی فیصلہ سنادیا کہ اپنے جیتے جی وہ اس گھر کو چھوڑ کر کہیں نہیں جائیں گے۔تم لوگوں کی نال تو نرسنگ ہوم والوں نے جانے کہاں گاڑی ہومگر میری تو یہیں گڑی ہے..... لہٰذا.....؟اس فرمان کے بعد ظاہر ہے کہ بحث ختم ہوگئی۔ان کے بچے فرماں بردار تھے اس لیے خاموش ہوگئے مگر مطالبہ ذہن سے محونہیں ہو اتھا۔اب انہیں انتظار تھا ایسے مناسب وقت کا جب وہ اپنی من چاہی مراد حاصل کرسکیں گے۔مطمئن چودھری آفاق بھی پوری طرح سے نہیں ہوئے تھے۔اتنی عمر کے بعد زندگی کے خاصے تجربے حاصل ہوہی جاتے ہیں اور بچوں کی نفسیات سے والدین تو بہر حال واقف ہوتے ہی ہیں۔بچے خواہ کتنے ہی ڈگری یافتہ ہوجائیں،نقل مکانی کا یہ سانپ فوری طور پر تو پٹارے میں بند ہوگیا تھا مگر کسے معلوم کب..... پھن نکال کر باہر آجائے.....؟

چودھری آفاق کے یہاں پانچ بچوں کی ولادت ہوئی مگر آگے پیچھے تین بچے داغ مفارقت دے گئے۔مرنے والے تینوں بیٹے ہی تھے۔چار بھائیوں میں ایک بہن تھی۔جو شادی کے بعد اپنے گھر چلی گئی اور اس کے بعد بیرون۔بیٹا سافٹ ویئر انجینئر ہوگیا اور کالج میں ہی Placement مل گیا۔ماں باپ کو جب معلوم ہوا کہ امریکہ کے لیے رخت سفر بندھ رہا ہے تو وہ حیران وششدر رہ گئے۔وہ سمجھ گئے تھے کہ سانپ باہر آگیا ہے اور اب کچھ نہیں ہوسکتا۔اتنے سارے غموں کے بعد بیگم خدیجہ بہت کمزور ہوگئی تھیں۔صحت کی خرابی اور مستقل سوچتے رہنے کے سبب کئی بیماریاں لگ گئیں اور پھر ایک دن خاموشی سے ہمیشہ کے لیے آنکھیں موندلیں۔چودھری آفاق کھلی آنکھوں سے یہ سارے عتاب جھیلتے رہے اور پھر کچھ عارضے میں خود بھی مبتلا ہوگئے۔

ان کے ساتھ ایک مسئلہ اور بھی تھا۔خواب دیکھنے کا۔ہر چند کہ خواب دیکھنا کوئی مسئلہ کیسے ہوسکتا ہے مگر ان کے ساتھ تھا۔ان کے خواب دوسروں سے مختلف تھے۔ایک تو وہ بہت زیادہ خواب دیکھتے تھے بلکہ شاید ہی کوئی رات ایسی گزرتی ہو کہ وہ خواب نہ دیکھتے ہوں اور یہ سلسلہ بھی خاصا پرانا تھا۔اس وقت وہ بہت چھوٹے تھے۔شاید..... سات، آٹھ..... برس کی عمر رہی ہوگی۔ایک خوفناک خواب دیکھ کر نیم شب کو ہی آنکھ کھل گئی۔وہ بری طرح ہانپ رہے تھے۔خوف سے تھرتھری بھی چھوٹی ہوئی تھی۔والدین کی بھی آنکھ کھل گئی۔ماں نے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔تھوڑی دیر بعد جب بچے کو تحفظ کا یقین ہوگیا تو سانسوں کا زیروبم کچھ کمزور ہوا اور تبھی ماں نے چمکارتے ہوئے وجہ دریافت کی گو کہ انہیں اندازہ پہلے ہی ہوگیا تھا۔بچے نے پورا خواب بیان کیا۔بہت دیر تک اسے پیار سے سمجھایا گیا اور پھر وہ بچہ ماں سے لپٹ کر سوگیا۔اس کے بعد سے یہ سلسلہ شروع ہوگیا۔اب وہ اکیلے نہیں لیٹتا تھا حالاں کہ وہ روز ڈراؤنے خواب نہیں دیکھتا مگر اس سے پہلے خواب نے اسے اندر تک اس قدر ہراساں کردیا تھا کہ اچھے بھلے خوابوں پر بھی اس کی گھگھی بندھ جاتی۔اب ماں باپ کو بھی تشویش ہونے لگی۔ابا ایک دن مولوی صاحب کے پاس لے گئے۔انہیں پوری روداد سنائی۔مولوی صاحب نے بچے کو اپنی گود میں بٹھالیا۔اس میں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔..... میں..... ابھی..... دم کیے دیتا ہوں۔ایک تعویذ بھی لکھ دوں گا۔خواب تو ایک فطری عمل ہے۔آپ گھبرا اس لیے رہے ہیں کہ اسے روز ہی خواب دکھتے ہیں۔انشاء اللہ ختم ہو جائیں گے۔تو آپ ..... خواب نہیں دیکھنا چاہتے؟ اس بار وہ بچے سے براہ راست مخاطب تھے۔جواب میں اس نے نفی میں گردن ہلائی پر خوددار..... خواب نہیں دیکھیں گے تو زندہ کیسے رہیں گے؟ان باتوں کے مطالب شاید ابھی آپ کی سمجھ میں نہ آئیں..... خواب..... زندگی ہیں..... بیٹا..... خواب نہیں تو

زندگی نہیں.....ان سے کیا ڈرنا..... آپ تو بہت پارے بچے ہیں۔ بہر حال مولوی صاحب کی باتوں سے بچے کی ہمت افزائی ہوئی۔انہوں نے برفی بھی کھلائی۔ جانے سے قبل تعویذ بھی دیا۔ بچے کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ وہ کسی حد تک مطمئن ہے۔شاید ان کی پھونک میں کچھ اثر رہا ہو۔مولوی صاحب کی ایک بات تو آفاق کے ابا کو بھی بہت اچھی لگی تھی۔خواب نہیں دیکھو گے تو زندہ کیسے رہو گے؟ یہ جملہ اپنی معنویت اور اہمیت کے بغیر آفاق کے ذہن سے بھی ایسا چپک گیا تھا کہ آج 55 سال بعد بھی الگ نہیں ہوا۔خواب دیکھنے کا سلسلہ تو تعویذ سے بھی نہیں ٹوٹا لیکن اس کے بعد خوف و ہراس ختم ہو گیا۔اب سوچتے ہیں تو لگتا ہے کہ تعویذ شاید دل بہلانے کے لیے ہی دیا ہو۔

شادی کے بعد انہوں نے ڈائری لکھنی شروع کی۔اس کے پیچھے کوئی خاص وجہ نہیں تھی۔ روز لکھتے بھی نہیں تھے۔کبھی کوئی بات جسے وہ قابل ذکر سمجھتے، اس کا اندراج کر لیتے۔ ورنہ ایسا نہیں تھا کہ صبح، شام کے معمولات اس میں قلم بند کریں۔بس یوں ہی ایک روز خیال آیا کہ انہیں ڈائری لکھنی چاہیے اور بس ہوگئی شروعات۔ڈائری کے صفحات میں جو درج تھا وہ سب ماضی تھا۔ذہن میں کتنی باتیں، یادیں۔ماضی بن کر محفوظ تھیں۔انہیں میں سے کچھ کا انتخاب کر کے ڈائری میں نقل کر لیا تھا۔

بارہ کمروں کے اتنے بڑے سے مکان میں سوچنے اور ماضی کو Explore کرنے کے علاوہ ان کے پاس کوئی اور کام نہیں تھا۔اب وہ دو خادماؤں کے رحم و کرم پر تھے۔ایک صبح سے رات کا کھانا پکا کر رکھ جاتی تو دوسری صفائی ستھرائی اور کپڑے وغیرہ دھونے کے لیے تھی۔ جب تک وہ گھر میں رہتیں، وہ ان سے خوب باتیں کیا کرتے۔ان دونوں کو بھی اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا کہ حد سے زیادہ اس گفتگو کے اسباب و علل کیا ہیں۔

کبھی بیٹی یا صاحبزادے کا فون بھی آجاتا۔ بیٹی تو سچ میں بہت محبت کرتی تھی۔

ایک ایک بات پوچھتی۔کچھ ہدایات اور تنبیہ بھی ہوتیں۔ بیٹے صاحب تو زیادہ وقت یہ پوچھنے میں گزار دیتے کہ پاپا آپ کو یہاں سے کچھ چاہیے تو نہیں..... پیسوں کی ضرورت..... تو..... نہیں..... کہیے تو اکاؤنٹ میں ڈال دوں۔اور وہ مستقل نہیں کرتے رہتے۔ جب کہ اسے خود معلوم ہے کہ اُس کے باپ کے ماہانہ خرچ سے چار گنا زیادہ پنشن ملتی ہے۔صاحبزادے نے ایک گوری چمڑی والی سے شادی کر لی ہے۔جیسا کہ اس نے بتایا ہے۔انہیں البتہ شبہ سا رہتا ہے۔اللہ جانے نکاح کیا بھی.....یا.....یوں..... ہی.....؟ایسے بہت سارے سوالات وہ اپنے آپ سے کرتے اور خود ہی مثبت، منفی جواب دیتے۔مقصد تو ہمزاد کو مطمئن کرنا تھا۔

وہ سوچتے ہیں کہ ابھی کتنا وقت گزرا ہے، جب یہ گھر لوگوں سے بھرا رہتا تھا۔ مکینوں کی تعداد ہی کیا کم تھی اوپر سے مہمانوں کا بھی تانتا لگا رہتا..... کیسا خوشگوار ماحول تھا۔کیسی خیر و برکت ہوا کرتی تھی۔ابھی کتنے دن پہلے کی بات ہے۔اور اب انہیں در و بام سے کیسی نحوست ٹپکتی ہے۔کبھی چوکھٹ نہ چھوڑنے کے اپنے فیصلے پر وہ نادم بھی ہوتے۔شاید وہاں اس سے بہتر گزرتی۔اس بات پر حالاں کہ کچھ تذبذب سا رہتا۔

جاگتی آنکھوں سے جتنے خواب دیکھتے تھے۔اللہ نے سب شرمندہ تعبیر کیے سوائے ایک خواب کے کہ وہ بھی اپنے بچوں کے علاوہ پوتے، پوتیوں کے ساتھ ایک ہی جگہ رہیں۔اب تو خیر نہ وہ تقاضا رہا اور نہ ہی امید۔اب یہی کسی روز چپ چاپ آنکھیں بند ہو جائیں گی۔مکان وہ پہلے ہی بیٹی کے نام کر چکے ہیں۔بس یہ ڈر ضرور لگا رہتا کہ موت کسی سانحہ سے نہ ہو اور نہ ہی کسی مہلک بیماری سے۔بس خاموشی سے آنکھیں بند کر لیں اور صبح کھولنا بھول جائیں تبھی ڈور بیل بجی۔انہوں نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ یہ آیا کے آنے کا وقت تھا۔تین بار گھنٹی بجنے سے اس کی تصدیق بھی ہوگئی۔اٹھ کر دروازہ کھولا۔وہ میمونہ ہی تھی جو کھانا پکانے پر

www.urduchannel.in

مامور تھی۔

گھر میں گھستے ہی اس نے سوالوں کی جھڑی لگادی۔''ابا..... کل.....
کہاں..... چلے گئے تھے۔بتایا کیوں نہیں .....یہاں تالا پڑا تھا وغیرہ..... وغیرہ
.....''بیٹا ملک الموت نے اگر ہمیں پہلے اطلاع دے دی ہوتی تو میں تمہیں بھی بتا دیتا''۔
اس کے بعد انہوں نے پوری تفصیل بیان کی۔میمونہ باورچی خانہ میں کام میں مصروف ہوگی
اور وہ پھر سے بستر پر آ کر لیٹ گئے۔بہت دیر سے ذہن خوابوں میں الجھا ہوا تھا۔وہ ایک بار
پھر سے اسی کے بارے میں سوچنے لگے۔ان کے کچھ خواب بہت عجیب طرح کے تھے۔
شاید وہ ڈائری میں درج تھے۔حالاں کہ وہ معتبر نہیں تھے مگر اتنی وابستگی کے بعد خوابوں سے
مراسم کی نوعیت اور طرح کی تھی اور وہ کسی حد تک تعبیریں بھی نکال لیتے تھے علاوہ ان خوابوں
کے جو اُن کی ڈائری میں درج تھے۔ہر طرح کے خواب تھے۔رومانی اور جنسی خواب بھی
بہت تھے۔جھگڑے..... فساد ..... قتل و غارت گری..... تصوف سے متعلق بھی
خاصے خواب تھے بلکہ شاید ہی کوئی موضوع بچا ہو جس سے وابستہ خواب اُن کے ذہن میں
محفوظ نہ ہوں۔سیٹ لائٹ چینلز سے پہلے وہ کتنی دنیا جہانوں کا سفر انہیں خوابوں کے ذریعہ
کر آئے تھے۔خواب انہیں بہت عزیز تھے۔شروع میں وہ خوف زدہ بھی ہوئے مگر بعد
میں زندگی پر اس کے بہت گہرے اثرات پڑے۔جاگتی آنکھوں سے دیکھے خواب بھی
حافظے میں تھے اور وہ کسی طرح شرمندہ تعبیر ہوئے۔بچوں کی پیدائش،ان کی پرورش
تعلیم.....اور پھر ایک ایک کر کے سب کا جدا ہو جانا۔

الگ رہنے کا خواب انہوں نے نہ کبھی سوتے میں دیکھا اور نہ کبھی جاگتے میں۔
اسی عذاب نے بیوی کی جان لی۔وہ خود بھی بہت صدمے میں رہے۔اس بات کا انہیں ہمیشہ
ملال رہا۔وہ اپنے بیٹے کے اس خواب کو کبھی نہیں بھول پاتے۔جب انہوں نے پوچھا تھا کہ

مستقبل کے بارے میں تمہارا کیا ارادہ ہے؟ کیا..... سوچا..... ہے...؟ بیٹے نے خود
اعتمادی سے بغیر جذباتی ہوئے جواب دیا تھا۔میں یو ایس اے میں سٹیل ہونا چاہتا ہوں۔
وہاں میرا اپنا ایک گھر ہو.....ایک شاندار Job، ایک امریکن Luxury
گاڑی Oh-what-a-Life یہ میرا Embition بھی۔جملوں کی ساخت اور حرکت
ہمہ وقت بازگشت کرتی۔اور ہر بار ان کی زبان پر آتا ہے''تو..... یہ..... ہے.....
تمہارا .....خواب''.....؟

ایک ہفتہ بعد معمول کی طرح صبح میمونہ نے ڈور بیل بجائی.....اس کے بعد
دروازہ کھٹکھٹایا مگر وہ نہیں کھلا..... ظاہر ہے تشویش بڑھتی تھی۔ذرا سی دیر میں بہت سے
اندیشے سائیں سے نکل گئے۔آس پڑوس کے لوگ بھی جمع ہو گئے۔کسی نے پولیس کو بھی فون
کر دیا۔کچھ ہی دیر میں پولس بھی آ گئی۔دروازہ توڑا گیا۔بستر پر چودھری آفاق امین کی لاش
پڑی ہوئی تھی۔ان کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔اپنی موت کے بارے میں انہوں نے جو
خواب دیکھا تھا وہ اسی طرح مکمل ہوا۔وہ یہی چاہتے تھے کہ کسی روز یوں ہی سوتے رہ
جائیں..... آنکھ کھولنے کا خیال ذہن سے غائب ہو جائے اور آج بالکل ویسا ہی ہوا تھا۔
جانچ پڑتال میں پولس کو معلوم ہو گیا کہ یہ کوئی حادثہ نہیں ہے۔ان کی موت فطری تھی یعنی
پولیس کا کام ختم۔ان کے بستر پر ایک ڈائری کھلی پڑی ہوئی تھی.....ایک قلم بھی..... تھا
..... آخری صفحہ پر کل کی تاریخ درج تھی۔ان کے ہاتھ سے لکھا ہوا یہ آخری جملہ جو غالباً کل
رات ہی تحریر کیا گیا تھا۔لوگوں کے لیے حیرت و استعجاب کا باعث بنا ہوا تھا۔''مل جل کر ایک
ساتھ رہنے کا خواب آنے والی نسلوں میں اب کوئی شاید ہی دیکھے''؟

(ماہنامہ'آجکل'نئی دہلی۔ستمبر 2013ء)

❁❁❁

www.urduchannel.in

مٹرو

تو آپ سب سے طاقتور کسے سمجھتے ہیں؟ سعید صاحب کے سوال پر میں پوری طرح سے ادھر متوجہ ہوا۔ اگر چہ میں کافی دیر سے بحث سن رہا تھا۔ یہ سوال ترویدی (بڑے بابو) سے کیا گیا تھا۔

نی سند یہہ امریکہ سے ادھک طاقتور کون ہے!!! فوراً ان کا جواب آیا۔ میں آپ کی بات سے متفق نہیں۔ سعید میاں بولے۔

ہمارے آپ کے سہمت ہونے، نہ ہونے سے کچھ نہیں ہوتا۔ دنیا جسے مان رہی ہے وہی واستو کتا ہے اور یہ سب کچھ اس نے اپنی شکتی سے ہی حاصل کیا ہے۔

سب سے کمزور آپ کسے مانتے ہیں؟ سعید شاید کچھ اور کریدنا چاہتے تھے۔

بڑے بابو نے انگلی سے چھت کی طرف اشارہ کیا۔ وہ اوپر والا۔

استغفر اللہ۔ سعید میاں نے برجستہ جواب دیا۔ میں بھی اب تک ان کے پاس پہنچ کر باقاعدہ ان کے گفتگو سننے لگا تھا۔ یہ روز کا معمول تھا۔ دفتر کا وقت شروع ہوتے ہی چائے کی چسکیوں کے ساتھ کوئی موضوع زیر بحث آجاتا اور سب اپنی معلومات کا پٹارا کھول

کر شروع ہو جاتے۔ سب کو اپنی بات کہنے کا برابر حق تھا۔

اچھا سعید میاں اگر اللہ کو ایک منٹ کے لیے ہٹا دیں تو آپ کی نظر میں سب سے طاقتور کون ہے؟ یہ چٹکی گپتا جی نے لی تھی۔

میرا عزم، مطلب اکشا شکتی۔ خود اعتمادی، اپنی ذات پر میرا یقین..... ترجمہ کے ساتھ ایک ایک لفظ پر زور دے کر سعید نے جواب دیا۔ بڑے بابو کے ہاتھ میں پانی کا گلاس تھا۔ سعید کا جواب سن کر وہ ہنسی پر قابو نہیں رکھ سکے جس کی وجہ سے منہ میں بھرا ہوا پانی ترشح کرتا ہوا باہر نکل آیا۔ ان کے حلق میں پھندا لگ گیا تھا۔ وہ تو عین وقت پر منہ دوسری طرف کر لیا ہوتا تو زد میں سعید ہی آتے۔ جیب سے رومال نکال کر چہرہ اور آنکھیں صاف کیں۔

اماں سعید بھائی آپ بھی خوب لطیفے سناتے ہیں۔

اس میں لطیفہ کہاں سے آ گیا؟ سعید بھی سکپکائے ہوئے تھے۔

باس کے بلانے سے تھرتھری چھوٹ جاتی ہے۔ آفس میں ہوں اس لیے صرف تھرتھری سے کام چلا رہا ہوں۔ باقی لوگوں نے بھی تائید میں سر ہلایا۔

اردلی سے پوچھتے ہیں کیوں بلایا ہے؟ کوئی خاص بات ہے کیا؟ موڈ کیسا ہے؟ اندر اور کون ہے؟ اور بھی جانے کیا کیا..... بڑے بابو نے سعید کی نقل اتارنے کی عمدہ کوشش بھی کی۔ اس بار بقیہ کی ہنسی بھی چھوٹ گئی۔ آگے کی بحث قہقہوں میں معدوم ہو گئی۔ اس کے بعد لوگ اپنی نشستوں پر کام کی تیاری میں لگ گئے۔

تبادلے کے بعد نئے شہر میں آئے ہوئے مجھے تقریباً ایک ماہ کا عرصہ گزر گیا۔ یہاں کے لوگ اتنے مخلص اور خوش گفتار تھے کہ مجھے احساس تک نہیں ہوا کہ کب میں ان کے ساتھ رچ بس گیا۔ محسوس کر لینے کی حد تک بھی عصبیت نہیں تھی۔ یہ ایک خوشگوار حیرت تھی۔

فوری طور پر ایک عزیز کے گھر پر ہی قیام تھا۔ ضد تھی اور میری بھی خواہش یہی تھی

www.urduchannel.in

کہ وہاں رہتے ہوئے میں اپنے لیے ایک بہتر مکان تلاش کرلوں گا۔ دفتر کے ماحول سے تو امید کے برخلاف کچھ جلد ہی مانوس ہو گیا تھا۔

نئے گھر کے لیے اب بیگم کا دباؤ بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ دوسرے کے گھر میں خواہ کتنا ہی آرام و آسائش میسر ہو لیکن اپنا گھر اپنا ہی ہوتا ہے۔ جلد ہی میں نے مطلوبہ مکان تلاش کرلیا۔ نقل مکانی سے قبل بیگم کو ایک بار بلا کر دکھا بھی دیا۔ مکان چوں کہ ان کی تمام شرائط سے بھی بہتر تھا اس لیے دیکھتے ہی ان کی باچھیں کھل گئیں۔ اب بس انتظار تھا بچوں کے امتحان ختم ہونے کا اور اس کے لیے بہت دن نہیں رکنا تھا۔ جلد ہی وہ وقت بھی آ گیا جب ٹرکوں میں ہمارا سامان نئے گھر پہنچ گیا۔ رنگ و روغن پہلے ہی ہو چکا تھا۔ بیوی نے ایک بار پھر نئے سرے سے گھر آراستہ کر دیا۔ ایک عدد ملازمہ کا بندوبست بھی ہو گیا۔ یہاں پر چوں کہ کئی ناتے، رشتہ دار پہلے سے مقیم تھے، اس بات سے بڑی تقویت ملی اور ان لوگوں نے حسب ضرورت ہماری مدد بھی کی۔ سارا سامان جب اپنے ٹھکانے سے لگ گیا تو بیگم کو قرآن خوانی کا خیال آیا۔ وہ میرے مقابلہ تھوڑی زیادہ مذہبی تھی۔ پہلی ہی چھٹی کا دن مقرر ہوا اور اطلاعات دے دی گئیں۔ مسجد میں بھی اعلان کرا دیا گیا۔

اللہ اللہ کر کے یہ مرحلہ بھی طے ہو گیا۔ سب لوگ بہت خوش تھے۔ پہلی بار اس شخص کو میں نے اسی دن دیکھا تھا، مجھے یاد آیا کہ آتے جاتے کئی بار راستے میں اس پر میری نظر پڑ چکی ہے مگر یہ کوئی نوٹس کرنے والی بات نہیں تھی۔ سڑک پر تو ہر طرح کے لوگ دِکھتے ہیں۔ انھیں میں سے ایک یہ بھی ہے۔ اسے دیکھ کر یہ اندازہ تو ہو ہی گیا تھا کہ وہ کوئی مفلس و نادار ہے۔ بہت بوسیدہ اور گندے کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ صرف اتنا بھر ہی دیکھنے سے کسی کے بارے میں کیا رائے بن سکتی ہے۔ اسے دیکھ کر اس پر ترس ہی آیا تھا۔

آج اسے اپنی چوکھٹ پر دیکھ کر تھوڑا تعجب ہوا۔ میں نے پہلی بار اسے بہت غور

سے دیکھا۔ اس کی عمر تیس کے آس پاس رہی ہوگی۔ رنگ گورا تھا مگر زردی مائل تھا۔ پیلا پن اتنا زیادہ تھا کہ نہ اس نے صرف اصل رنگ کو دبا دیا تھا بلکہ ایک نیا ہی رنگ بنا دیا تھا۔ ابٹن میں نہانے کے بعد کے جیسا۔ اندر کو دھنسی ہوئی بے رونق آنکھیں، بہت نحیف و کمزور سا، الجھے اور گندے بال، داڑھی نہیں تھی لیکن شیو ایک مہینہ سے کم کا نہیں تھا۔ کپڑے آج بھی معمول کے مطابق صاف نہیں تھے۔ یقیناً ناپاک بھی ہوگا۔ یہ یہاں؟ کیوں؟ کمبخت ہے کون؟ اور بھی کئی طرح کے سوال فلیش ہوئے۔

''بھائی کھانا مل جائے گا؟'' پہلی بار اس کی آواز سنی۔ جواب دینے کے بجائے میں نے اثبات میں سر کو جنبش دی۔ اپنے ساتھ لے کر اسے اندر گیا، جس کمرے میں لوگ کھانا کھا رہے تھے، ایک پلیٹ میں بریانی نکلوا کر اسے دی۔ وہ وہیں زمین پر بیٹھ کر ایک دم سے ٹوٹ پڑا۔ دیگ پر بیٹھے ہوئے شخص سے میں نے کہہ دیا کہ اسے پیٹ بھر کے کھلا دے۔ تھوڑی دیر بعد وہ باہر آیا تو چہرے پر پیٹ بھرے ہوئے کی سرشاری جھلک رہی تھی۔ چہرے کے بالوں میں چاول کا ایک دانہ اور پانی کی بوندیں چمکتی ہوئی دکھائی دیں۔ کہیں نہ کہیں میں بھی خوش تھا کہ ایک مستحق کو کھانا کھلانے کی توفیق نصیب ہوئی۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر مجھے سلام کیا اور آگے بڑھ گیا۔

اس کے بعد روز ہی اس سے ملاقات ہونے لگی بلکہ وہ خود ہی ملنے لگا۔ میں سودا سلف لینے سڑک پر جاتا تو وہ جانے کہاں سے نمودار ہو جاتا۔ 'بھائی دو روپے دیدو' کہہ کر کبھی سر کھجانے لگتا، کبھی جسم کے کسی اور حصہ پر ہاتھ پھیرنے لگتا، بدبو کا ایک بھبکا اس کے پاس سے اٹھتا۔ میں جلدی سے دو روپے دے کر چھٹکارا حاصل کر لیتا۔

تقریباً یہ معمول بن گیا تھا۔ بہت کم ہی ایسا ہوتا کہ میں سڑک سے گزروں اور وہ میرے سامنے نہ آئے حالاں کہ اس میں ایسی کوئی بات نہیں تھی کہ مجھے حیرت ہو۔ چوں کہ

میں نے کبھی اسے منع نہیں کیا تھا شاید اس لیے وہ آسانی سے ہمت کر لیتا ہو۔ ہر چند کہ لوگوں کو بہت بری طرح سے اسے دھتکارتے ہوئے دیکھا تھا۔ اب تک مجھے اس میں کوئی دلچسپی نہیں پیدا ہوئی تھی۔ اس وجہ سے میں نے اس کے متعلق کچھ جاننے کی کوشش بھی نہیں کی اور تو اور اس کا نام تک نہیں معلوم تھا۔ اس طرح تقریباً دو ماہ کا عرصہ گزر گیا۔ حسب معمول ایک بار پھر وہ میرے پیچھے کھڑا تھا۔ بھائی آج پانچ روپے دے دو، اس بار میں نے اسے اس طرح غور سے دیکھا جس طرح پہلی بار قرآن خوانی والے دن دیکھا تھا۔ مجھے لگا کہ وہ مجھے کچھ زیادہ ہی بے وقوف سمجھ رہا ہے۔ میں اس کی ہمت پر حیران تھا۔ اس کا حوصلہ زیادہ ہی بڑھ رہا تھا۔ چند لمحوں میں ہی مجھے فیصلہ کرنا تھا۔ میں نے سوچا کہ یہ پہلی بار ہے۔ اگر آئندہ بھی وہ اتنی ہی رقم کا مطالبہ کرتا ہے تو کوئی سخت قدم اٹھانا پڑے گا۔ سخت قدم پر میں نے بعد میں غور کیا کہ وہ کیا ہو سکتا ہے تو عجب مضحکہ خیزی سی پیدا ہوئی۔ ممکن ہے وہ جھوٹ نہ بول رہا ہو، کیا پتہ کیا ضرورت ہے۔ ہو سکتا ہے بھوکا ہی ہو اور پھر پانچ روپے کی کیا اوقات۔ بہر حال میں نے ایک پانچ کا سکہ اُسے تھما دیا۔ اس کا چہرہ دیکھ کر لگا جیسے اسے پختہ یقین تھا کہ میں انکار نہیں کروں گا۔ اب میرے چہرے پر وہ رنگ تھے جو پیسے ملنے سے پہلے اس کے چہرے پر تھے۔ وہ خاموشی سے آگے بڑھ گیا۔ میں بچے کو اسکول بس کے لیے چھوڑنے موڑ تک جاتا تو وہ اکثر موڑ سے پہلے کچھ دکانیں تھیں جو دیر سے کھلتی تھیں، ان کے چبوترے پر لیٹا دکھائی دیتا۔ زیادہ تر سوتا ہوا ہی ملتا، کئی بار بیداری کی حالت میں بھی دیکھا، پر اس کی کیا بیداری اور کیا نیند۔ آنکھیں چار ہوتیں تو ہاتھ اٹھا کر سلام کرتا۔ اس کے اعتبار سے مراسم زیادہ بہتر ہو گئے تھے۔ ورنہ پہلے وہ سلام کی زحمت نہیں کرتا تھا۔ مجھے تو ہمہ وقت بس یہی دھڑکا لگا رہتا کہ اب کہے گا بھائی دو روپے دے دو۔ شاہراہ پر جب تک دکھائی نہیں دیتا آواز کی بازگشت محسوس ہوتی رہتی۔ شاید اتنی صبح مانگنا اسے مناسب نہ لگا ہو۔ دیکھ کر بھی یوں ہی لیٹا رہا پر

www.urduchannel.in

ماننے والوں کے بھی کیا کچھ اصول و آداب ہوتے ہیں۔ میں خود ہی سوال جواب کرتا ہوا اس کے سامنے سے گزر گیا۔

ایک دن میں اپنے ایک عزیز کے یہاں بیٹھا ہوا تھا۔ ان کے لڑکے نے بتایا کہ سہیل نے مٹرو کو بہت مارا۔ ناک سے خون نکل آیا۔ کیوں؟ لڑکے کے والد نے دریافت کیا۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ کون سہیل اور یہ مٹرو کون۔ یہ بھی کیا نام ہوا۔ مٹرو اِس سے قبل کہ میں بولتا، لڑکے نے تفصیل بتانی شروع کی۔ کسی بچے کی گیند نالی میں چلی گئی تھی۔ انھوں نے مٹرو سے کہا۔ اس نے دو روپے مانگے۔ وہ تیار ہو گیا۔ اس نے فوراً نالی سے گیند نکال دی۔ بچے گیند لے کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ سہیل اس کا بڑا بھائی تھا۔ مٹرو نے جب دو روپے کا تقاضا کیا تو سہیل نے اس کی ٹھکائی کر دی۔ اب تک شاید میں مٹرو کو پہچان گیا تھا۔ پھر بھی زیر لب نکل ہی گیا مٹرو کون؟

ہے ایک نیم پاگل سا آدمی۔ عزیز نے جواب دیا۔ شئے بھائی آپ نے دیکھا تو ہے۔ قرآن خوانی والے دن آیا تو تھا۔ آپ نے اندر لے جا کر بریانی کھلائی تھی۔

اس کا نام مٹرو ہے۔ پھر اسی انداز میں میرے لب ہلے۔

نام تو مطلوب ہے مگر یہ ہم ہی لوگوں کو معلوم ہے۔ پہلی بار ایک الگ طرح کی ہمدردی کا احساس ہوا۔ اب چوں کہ باقاعدہ اس کا ذکر ہو رہا تھا تو میں نے بھی کچھ سوال کر ڈالے، کچھ نئے انکشافات سامنے آئے۔ مثلاً یہ کہ اس کے والدین کا انتقال ہو چکا ہے۔ دو بہن اور دو بھائی ہیں۔ بہنیں شادی کے بعد اپنے گھروں کی ہو گئیں۔ بڑے بھائی کی مکان پر نیت خراب ہو گئی اور اس نے اسے گھر سے نکال دیا۔ یہ کام ویسے اتنا آسان نہیں تھا پر چوں کہ بڑا روزگار سے لگا ہوا تھا اور یہ ٹھہرا بے روزگار، مقدمہ لڑنے تک کے پیسے نہیں تھے۔ عزیز و اقارب اور محلے کے لوگ بھی بیچ میں پڑے، جیب میں پیسے ہوں تو بیچ میں پولیس کے

www.urduchannel.in

پڑنے سے بھی کچھ نہیں ہوتا۔اس کا بھی نہیں ہوا۔

بھوک، عزت اور مرتبہ نہیں دیکھتی۔ زندہ رہنا ہے۔ اگر کام نام نہیں ہے تو ہاتھ پھیلانا ہی پڑے گا۔ اور بس اسی دن سے جب تک بدن میں خون رہا، اسپتالوں میں بیچتا رہا۔ یہ مراد آبادی رنگ اسی وجہ سے ہے۔ اس کے تو بچنے کی امید بھی ختم ہوگئی تھی۔ ڈیڑھ مہینے سرکاری اسپتال میں رہا۔ پتا نہیں کیسے بچ گیا۔ باپ بیٹے برابر سے میری معلومات میں اضافہ کرتے رہے۔ جانے کہاں سے پیپل کے پتے توڑ کر لاتا ہے اور ٹکے کے حساب سے لوگوں کو بیچ دیتا ہے۔ اماں چھوڑو، ہم بھی کس کا ذکر لے کر بیٹھ گئے حالاں کہ میں اس کے بارے میں اور زیادہ جاننا چاہتا تھا، پر یہ موقع نہیں تھا اس لیے میں خاموش ہی رہا۔ اس دن کے بعد سے مٹرو سے ایک نامانوس سی قربت ہوگئی تھی۔ میرے اندر اس کے لیے کچھ نرم گوشے پیدا ہوئے تھے۔

رات سونے سے قبل روز کا آخری مرحلہ ٹی وی بیگم اپنا پسندیدہ سیریل دیکھنے میں منہمک تھیں۔ آنکھیں تو میری بھی ٹی وی اسکرین پر لگی تھیں پر ذہن کہیں اور تھا۔ اچانک کوکر کی سیٹی بجی، بیگم ریموٹ رکھ کر باورچی خانے کی طرف گئیں تو جیسے مجھے کچھ یاد آیا۔ میں جھٹ سے رموٹ اٹھایا Sport Channel لگا کر دیکھا تو کوئی پسند کا میچ نہیں آرہا تھا۔ میں نے پھر چینل بدلا۔ یہاں Wildlife پر کوئی پروگرام آرہا تھا۔ میں کچھ سمجھ پاتا کہ چیتے نے دبے قدموں سے چلتے ہوئے جو رفتار پکڑی تو مجھے وہ اشتہار یاد آیا جو ایک موٹر بائیک کی خوبیوں کے ساتھ ایسے ہی چیتے کو دوڑتے ہوئے دکھاتے ہیں، ہرن بھی جست و قلانچے مارنے میں بہت ماہر ہے مگر طاقت کے معاملہ میں ہے تو بہت ہی کمزور، ہرن کی گردن اس کے دانتوں میں تھی۔ عجب بے چارگی سے یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ میں طے نہیں کر پا رہا تھا کہ میں چیتے کی طرف ہوں یا ہرن کی طرف۔ تب تک بیگم بھی آگئیں۔ میرے ہاتھ سے ریموٹ اچکتے ہوئے بولیں۔ آپ

بھی یہ سب کیا فالتو چیزیں دیکھتے رہتے ہیں۔ میرے چہرے پر ایک معنی خیز مسکراہٹ تیر گئی۔

اس علاقے میں رہتے ہوئے مجھے پانچ ماہ گزر گئے۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا۔ آفس میں روز کسی نئے موضوع پر بحث ہوتی۔ میں مٹرو کو ہر بار پیسے دیتا۔ ابھی تک میں نے اسے ایک بار بھی منع نہیں کیا۔ کبھی کبھی مجھے ڈر سا البتہ لگنے لگتا ہے۔ پتہ نہیں کب کیسا موڈ ہو، میں کسی الجھن میں ہوں، ان باتوں سے بے پرواہ وہ جیسے سارا دن کہیں چھپ کر میرا انتظار کرتا ہے۔ ایسے نظر ڈالنے پر کہیں نہیں دکھے گا، بس ذرا سا کہیں رکے اور دائیں بائیں سے نکل کھڑا ہو جائے گا۔ بھائی دو روپے دو، اس جملے کی بازگشت کئی بار مجھے حیران کر چکی تھی۔

آج صبح میں بیٹے کو بس تک چھوڑنے گیا تو وہ پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ بولا کچھ نہیں۔ پہلی بار مجھے بہت ناگوار لگا تھا۔ عجب آدمی سے پالا پڑا ہے نہ کوئی وقت دیکھے گا نہ یہ کہ آدمی کس حالت میں ہے۔ خود میرے پاس بھی دو روپے ہیں یا نہیں۔ میں ناراضگی کا اظہار بھی کرنا چاہتا تھا پر جانے کیا سوچ کر ضبط کر گیا۔ میں نے اس کی طرف سے توجہ ہٹانے کی کوشش کی۔ کچھ دیر ٹھہرنے کے بعد وہ وہاں سے آگے بڑھ گیا تو میں نے راحت کی سانس لی۔ چند لمحوں کے بعد میں نے دیکھا کہ گلی کے آوارہ کتوں سے دو جانے کہاں سے نکل آئے اور اس پر بھونکنے لگے۔ وہ اچانک اس حملے کے لیے قطعی تیار نہیں تھا۔ وہ ہڑبڑاہٹ میں گر بھی گیا۔ چہرے کی ہوائیاں بتا رہی تھیں کہ وہ کتنا خوفزدہ ہے۔ تبھی اس کے ہاتھ میں اڈّھا آگیا۔ وہ بجلی کی سی تیزی سے اٹھا، کتوں نے یقیناً اس کے ہاتھ میں آئی ہوئی چیز دیکھ لی تھی۔ دونوں حیرت انگیز طور پر پیچھے کھسک گئے۔ وہ ہاتھ اٹھائے اسی طرح اپنی طاقت کا رعب غالب کیے رہا۔ آخر کار کتے گلی میں دبک گئے۔ ادھا پھینک کر وہ بھی اپنی راہ چلا گیا۔

اسی شام میں کچھ سودا سلف لینے سڑک پر گیا وہیں ایک دو شناسا لوگ مل گئے تو

www.urduchannel.in

وہیں کھڑے ہوکر کچھ رسمی سی گفتگو کرنے لگا۔ میری نظر ادھر ادھر بھٹک رہی تھی کہ اب آیا اور تب آیا اور عین اسی وقت پیچھے سے آواز آئی۔ بھائی دو روپے دے دو۔ اس کے کہنے سے پہلے ہی میں شروع ہوگیا۔ تمہیں شرم نہیں آئی، میرا باہر نکلنا دوبھر کردیا ہے۔ برداشت کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ آج تو صبح ہی کھڑے ہوگئے تھے، نہ کوئی موقع دیکھو، نہ وقت۔ بس دو روپے دے دو۔ میں نے کوئی ٹھیکا لے رکھا ہے تمہارا، ساتھ کھڑے لوگوں نے بھی میری حوصلہ افزائی کی تو میرا لہجہ تھوڑا اور کرخت ہوگیا۔ جانے کیا کہہ ڈالا اُسے۔

ایک نے مجھ سے ہمدردی دکھاتے ہوئے کہا کہ آپ بھی کہاں پھنس گئے شاید نئے ہونے کی وجہ سے۔ محلے میں تو سب جانتے ہیں اسے اسی لیے یہ نئے لوگوں کی تلاش میں رہتا ہے۔ وہ ایک لفظ بھی نہیں بولا۔ بس خاموش کھڑا سنتا رہا اور پھر دور ایک چبوترے پر جا کر لیٹ گیا۔ میں واپس لوٹا تو وہ دوسری طرف کروٹ کیے ہوئے لیٹا تھا۔

اس واقعے کو تقریباً ایک ہفتہ گزر گیا۔ مٹرو مجھے دوبارہ سڑک پر نہیں دکھا، میں ٹھہر کر ادھر ادھر نگاہ ڈالتا ہوں۔ میرے ہاتھ میں پانچ روپے ہیں پر مٹرو مجھے کہیں نہیں دکھتا اور ہر بار میں سکہ واپس جیب میں رکھ لیتا ہوں۔ یہ شبہ بھی ہوتا ہے جیسے پہلے کی طرح کہیں چھپ کر مجھے دیکھتا ہے اور جان بوجھ کر سامنے نہیں آتا۔ کھیل تو اب بھی وہ چل رہا تھا۔ بس ترتیب الٹ گئی تھی۔ اب سڑک پر دیکھتے ہی سامنے نہیں آجاتا۔ میں نے سوچا کہ میں خود ہی تلاش کروں۔ بے نیازی سے اس کے پاس جا کر کھڑا ہوجاؤں وہ سمجھ بھی نہ پائے اور میرا مقصد پورا ہوجائے۔

بہرحال وہ سب میرا وہم تھا۔ بہت تلاش کے بعد بھی مٹرو مجھے کہیں نظر نہیں آیا۔ میری تشویش اب زیادہ بڑھ رہی تھی۔ اچانک کہاں غائب ہوگیا۔ کمبخت زندہ ہے بھی یا نہیں۔ ہر طرح کے سوال ذہن میں آرہے تھے۔ میں خود پر بھی جھنجھلا رہا تھا۔ کہاں سے کہاں ایک

اچھی خاصی الجھن میں مبتلا ہوگیا تھا۔ میں چاہ کر بھی اپنے ذہن سے نہیں نکال پا رہا تھا۔ دو ایک لوگوں سے دریافت بھی کیا مگر کوئی خاطر خواہ جواب نہیں ملا۔ جائے گا کہاں؟ کہیں پڑا ہوگا سالا۔ مگر آپ اس کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہیں؟ جواب کے ساتھ انھوں نے سوال بھی داغا۔ 'بس یوں ہی' کہہ کر کسی طرح پیچھا چھڑایا۔

غالباً دس بارہ روز بعد وہ اچانک نظر آگیا۔ موڑ والے چبوترے کے پاس بیٹھا بری طرح چیخ رہا تھا۔ شرم نہیں آتی تجھے، جینا ہلکان کر رکھا ہے، ہمت ہے تو سامنے آؤ، جانے کہاں چھپا بیٹھا ہے۔ اس نے سر اٹھا کر اوپر کی طرف دیکھا، میں نے بھی ایسا ہی کیا۔ کئی لوگ چھجوں، کھڑکیوں سے جھانک رہے تھے۔ زمین پر بھی کئی لوگ تماشائی کی صورت میں موجود تھے۔ میں سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ جھگڑا کس سے ہوا ہے کیوں کہ دوسرا کوئی بھی ایسا نظر نہیں آرہا تھا، جو اس شاخسانے کا دوسرا فریق ہو۔ مٹرو اپنی سانسوں کا زیر و بم بحال ہونے کے بعد پھر شروع ہوا۔ جینا دوبھر کردیا ہے، نکل کیوں نہیں رہا ہے۔ عقدے کا کوئی سراغ میرے ہاتھ نہیں لگا تھا اور جب مجھ سے نہیں رہا گیا تو پاس کھڑے ایک شخص سے پوچھ لیا، معاملہ کیا ہے؟ کس سے لڑ رہا ہے؟ اس آدمی نے مجھے غور سے دیکھا اور بڑے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے گویا ہوا:

وہ ادھر آسمان کی طرف اشارہ کیا تھا اس نے ادھر کون۔ میں شاید سمجھتے ہوئے بھی انجان بن رہا تھا۔

ادھر اور کون ہے۔ اللہ میاں سے لڑ رہا ہے۔ اس کے جواب پر مجمع نے ایک ساتھ قہقہہ لگایا۔ میں ہونق بنا سارا تماشا دیکھتا رہ گیا۔ فضا میں اب صرف ٹھہاکوں کی آواز باقی تھی۔

(شعر و حکمت، حیدرآباد۔ کتاب 11، دور سوم)

❁❁❁

www.urduchannel.in

درخت

وہ روز کی طرح اپنے وقت پر دفتر سے گھر واپس آ گئے اور حسب معمول صحن میں پڑی کرسی پر بیٹھ گئے۔ میز پر چمڑے کا چھوٹا سا پرس رکھا اور کرسی سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔ آرام کا ان کا یہ اپنا طریقہ تھا۔ دس پانچ منٹ وہ اسی طرح گزارتے۔ اس کے بعد کپڑے تبدیل کر منہ دھوتے اور پھر واپس اُسی کرسی پر۔ اتنی دیر میں نجمہ چائے بنا لیتی اور پھر دونوں بیٹھ کر باتیں کرتے۔ چائے تو ذرا دیر میں ختم ہوتی مگر گفتگو کا سلسلہ کافی دیر تک قائم رہتا۔ تقریباً یہ روز کا معمول تھا۔ نجمہ کی آواز پر وہ چونکے۔ جھٹ آنکھ کھولی تو وہ سامنے کرسی پر بیٹھ چکی تھیں۔ ''آخر..... داغ لگا..... ہی لیے.....؟'' فوراً ان کا دھیان اپنی نئی سفید شرٹ کی طرف گیا جس پر پان کے دھبے نمایاں تھے۔ جواب میں وہ مسکرا دیے۔

''آپ مسکرا کر بات نہ ٹالا کیجیے۔ میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ سفید کپڑے آپ نہ پہنا کریں۔ غضب خدا کا ایک دن بھی محفوظ نہ رکھ سکے۔ سفید کپڑوں پر یہ داغ دور سے ہی نظر آتے ہیں۔''

''معلوم..... ہے بیگم..... اور کاٹن کے کپڑوں پر بلیچ سے بھی نہیں جاتے مگر

میں نہ پان چھوڑ سکتا ہوں اور نہ سفید کپڑوں کا موہ۔'' جواب دیتے ہوئے ان کی مسکراہٹ اور گہری ہوگئی۔ اس بار نجمہ بھی اپنا تبسم نہیں روک سکیں۔ ''اچھا..... آپ منہ دھوئیے، میں چائے بناتی ہوں۔''

''کیا عارف کا فون آیا تھا.....؟'' بیوی کے اٹھنے سے پہلے انہوں نے دریافت کیا۔ ''نہیں..... آج..... بھی..... نہیں آیا''۔ ''چلو میں ابھی ملاتا ہوں''۔ کہہ کر وہ اٹھ گئے اور نجمہ بھی باورچی خانے کی طرف چلی گئیں۔

عارف ان کا لڑکا تھا اور دوسرے شہر میں ایک بہت اعلا اور معیاری سرکاری ادارے سے B.Tech کر رہا تھا اور یہ اس کا آخری سال تھا۔ اس ادارے میں داخلے کا خواب تو انہوں نے اس کی اوائل عمری میں ہی دیکھا تھا مگر یہ یقین نہیں تھا کہ خواب شرمندۂ تعبیر بھی ہوگا۔ چوں کہ یہاں داخلے کے لیے ذہانت کے ساتھ قسمت بھی ضروری تھی۔ بہر حال معرکہ فتح ہو گیا تھا جس کے عوض وہ بہت سرخرو ہوئے تھے۔

عارف حالاں کہ شروع سے ہی پڑھائی میں بہت تیز تھا۔ بعض لوگ پڑھنے میں تو بہت تیز ہوتے ہیں مگر زندگی کے دوسرے شعبوں میں ذہانت اس طرح ساتھ نہیں دیتی۔ اس کے برخلاف عارف باقی معمولات میں بھی بہت حساس و ذہین تھا اور اس بات پر ماں، باپ ناز کرتے تھے۔

عارف نے جب اسکول جانا شروع کیا اور پڑھائی کی طرف اس کی غیر معمولی دلچسپی دیکھی، تبھی فرید میاں نے طے کر لیا تھا کہ بچے کو انجینئر بنائیں گے۔ وہ ایک سرکاری دفتر میں بابو کی نوکری کر رہے تھے اور ملازمت سے سبک دوش کا پورا ایک سال بچا تھا۔ تنخواہ بہت قلیل نہیں تھی مگر اتنی زیادہ بھی نہیں تھی کہ پیسوں کی فراوانی رہے۔ فنڈ کا پیسا بھی نکال چکے تھے۔ نصف پیسا بیٹی کی شادی میں خرچ ہو گیا اور باقی عارف کی پڑھائی میں لگ گیا بلکہ

بینک سے لون Loan بھی لینا پڑا۔ابّا کا پشتینی مکان تھا جو انہیں مل گیا تھا جس سے کرائے سے بچ گئے۔دال روٹی سکون سے چل رہی تھی۔اب تو یہی سوچتے کہ اگلے سال عارف انجینئر بن کر آجائے گا اور وہ ریٹائر ہو جائیں گے پھر بڈھیا،بڈھے گھر میں رہ کر پوتے پوتیوں کے ساتھ عیش کریں گے۔انہوں نے تو یہاں تک سوچ لیا کہ عارف کی شادی کے بعد کسی سے کہلوا دیں گے کہ صرف دو بچوں پر ہی قناعت نہ کرے۔اس فیصلے سے بعد میں بہت پچھتاوا ہوتا ہے۔گھر میں جتنے زیادہ لوگ ہوتے ہیں اتنی ہی رونق ہوتی ہے۔یہ عذاب چوں کہ وہ خود جھیل رہے تھے اس لیے زیادہ احساس تھا کہ ان کے بیٹے کو یہ دن نہ دیکھنا پڑے۔

چائے وغیرہ سے فارغ ہوئے تو خیال آیا کہ عارف کو فون کرنا ہے۔موبائل اٹھا کر اُس کا نمبر ملانے لگے۔پہلی بار میں فون نہیں اٹھا وہ کچھ فکر مند ہوئے۔یہ کلاس کا وقت بھی نہیں تھا فوراً ہی دوبارہ ملایا۔اس بار فون اٹھ گیا۔’’کیا حال ہے بیٹا...... خیریت...... تو ہے...... فون کیوں...... نہیں...... اٹھایا......؟تم نے فون بھی نہیں کیا۔ہم لوگ پریشان ہو رہے تھے......۔‘‘ایک ساتھ اتنے سارے سوال کر ڈالے۔عارف نے ان کے ہر سوال کا اطمینان بخش جواب دیا۔پڑھائی کے متعلق بھی بات کی بعد میں ماں سے بھی گفتگو ہوئی۔دونوں نے خوب ڈھیر ساری دعائیں دیں۔فون کا رابطہ منقطع ہونے کے بعد فرید میاں کچھ فکر مند سے دکھے۔’’بیگم...... مجھے...... عارف کچھ پریشان لگ رہا ہے۔تمہیں نہیں لگتا کہ اس کے لیے میں آج وہ گرمی اور بشاشت نہیں تھی۔‘‘میاں کی بات پر بیوی نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔’’کہہ تو آپ ٹھیک رہے ہیں۔شبہ تو مجھے بھی ہوا تھا پر میں نے سوچا کہ ہوسکتا ہے میرا وہم ہو‘‘۔’’والدین کو بچوں کے بارے وہم نہیں ہوتا لیکن اب کیا کیا جائے۔دوبارا فون کرنا مناسب ہوگا یا نہیں۔اس بات پر غور وخوض ہونے لگا۔طے یہ ہوا کہ ابھی فون نہیں کریں گے۔وہ بھی پریشان ہوسکتا ہے۔اس کے بارے میں کل استفسار کیا جائے گا۔

اپریل کے آخری دن چل رہے تھے۔مغرب کی اذان میں ابھی وقت تھا۔شام ڈھلنا شروع ہو چکی تھی۔ان کا یہ وقت پیڑ پودوں کی دیکھ بھال کے لیے مختص تھا۔ان کا گھر چوں کہ پرانی طرز تعمیر کا تھا۔اس وقت زمین اتنی سکڑی ہوئی نہیں تھی۔خوب بڑے بڑے کمرے،کشادہ صحن،جس کے کنارے انہوں نے کیاریاں بنالی تھیں جس میں بہت سارے پودے لگے ہوئے تھے۔گملے بھی خاصے ہوگئے تھے۔کئی بیلیں چھت کی منڈیروں تک چڑھ گئی تھیں۔کونے میں امرود کا ایک درخت جو عارف کی پیدائش کے آس پاس ہی لگایا تھا۔اب تو خوب بڑا اور گھنا ہو گیا تھا۔فصل کے دنوں میں امرودوں سے لدا رہتا۔اتنے میٹھے امرود تھے کہ لوگ ہر بار تعریف کرنا نہیں بھولتے اور ساتھ میں حیرت کا اظہار بھی ہوتا کہ اس پیڑ میں کتنی برکت ہے۔مہمانوں کو باندھ کر بھی دیے جاتے۔آس پڑوس کے لوگ بھی لے جاتے مگر امرود تھے کہ کم ہی نہیں ہوتے۔بعض اوقات تو فرید میاں بھی اوپر والے کا خصوصی فیضان سمجھتے۔حالاں کہ انہوں نے اپنے پیڑ پودوں کا خیال کسی بچے کی طرح ہی رکھا تھا مگر کسی شجر کے یہ کشف کرامات صرف ان کے پسینے کے عوض تو ممکن نہیں باغبانی کا شوق فرید میاں کو بچپن سے ہی تھا۔تجسس معلومات میں اضافہ ہی کرتا ہے۔اب تو اتنا وقت گزر گیا تھا اس لیے ضرورت بھر کی معلومات انہیں حاصل ہوگئی تھی بلکہ وہ دوسروں کو بھی مشورے عنایت کرنے لگے تھے۔

موسم سرما میں کیاریاں رنگ برنگے پھول،پتیوں سے گلنار رہتیں۔فرید میاں کے کلیجے کو ٹھنڈک پہنچتی۔گرمی کے دنوں میں رات رانی اور بیلا اس قدر مہکتا کہ دور تک فضا معطر ہو جاتی۔پوری گرمی بھر وہ صحن میں ہی سوتے اور کوکر،اے سی میں سونے والوں کو کوستے

www.urduchannel.in

۔حلال رزق کمانے والوں کو تو نیند کہیں بھی آسکتی ہے مگر خوشبو دار پودوں کے ساتھ کھلے آسمان میں تاروں کو گنتے ہوئے سونے کا لطف اب کتنے لوگوں کو معلوم ہے۔

آج کی رات روز جیسی نہیں ہے۔کچھ تبدیلی تو ہوئی تھی۔عارف کی طرف سے وہ فکرمند تھے۔کیا بات ہوسکتی ہے۔ہم لوگوں سے چھپانے والی کیا کوئی بات عارف کے ذہن میں ممکن ہے۔طرح طرح کے خیالات۔ساتھ میں کچھ نامعلوم اندیشے۔وسوسے کہیں سچ میں یہ وہم تو نہیں مگر دل یہ آخری بات ماننے کو تیار نہیں۔بہت رات تک بیگم سے ہر شک و شبہ پر بات کرتے رہے۔دونوں ایک دوسرے کو دلاسا دیتے رہے اور پھر جانے کب وہ نیند کی تاریک سرنگ میں داخل ہوگئے۔

صبح دیر سے آنکھ کھلی۔دونوں کی فجر بھی قضا ہوگئی۔اٹھتے ہی پھر وہی موضوع۔ رات جہاں سے سلسلہ منقطع ہوا تھا دوبارہ شروع ہوگیا۔ابھی تو وہ سو رہا ہوگا۔رات دیر تک پڑھائی کرتا ہے اس لیے کلاس جانے کے وقت ہی آنکھ کھلتی ہے۔اس وقت اسے ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں ہوگا۔سوچا کہ دفتر جانے کے وقت فون کریں گے تاکہ جانے سے قبل نجمہ بھی مطمئن ہوجائے اور وہ خود بھی۔رات پودوں کو تو کسی طرح کھاد پانی دے دیا لیکن اس کے بعد کسی کام میں جی نہیں لگا۔ذرا سی فرصت ملی تو احساس کی شدت بڑھنے لگی۔جیسے تیسے دو گھنٹے اور گزر گئے۔انہیں لگا کہ اب عارف اٹھ گیا ہوگا۔انہوں نے فون ملا کر اسپیکر Speaker آن کردیا۔رنگ ختم ہونے سے پہلے فون اٹھ گیا۔''السلام علیکم.....ابو.....۔''عارف کی آواز آئی۔دونوں نے ایک ساتھ وعلیکم السلام کہا۔جو بات فرید میاں کو رات سے ہلکان کیے ہوئی تھی آخر زبان پر آگئی۔''بیٹا سب خیریت.....تو.....ہے۔'' گلا کچھ روندھ سا گیا تھا۔''ہاں.....ابو.....۔''بیٹا شام کو تمہاری آواز میں کچھ تبدیلی تھی۔ہم لوگوں کو فکر ہوگئی۔تمہاری امی بھی پریشان ہوگئی۔''

''نہیں..... کوئی.....بات نہیں ہے.....۔بس یوں ہی ذرا سر میں درد ہے۔''اس جملے کے بعد دونوں نے راحت کی گہری سانس لی۔رات سے بگڑے ہوئے چہرے کے تاثرات خود بخود بہتر ہوگئے۔دونوں نے خوب ڈھیر ساری دعائیں دیں۔خوب جی لگا کر پڑھنے کی تلقین کی۔کسی طرح کی کوئی پریشانی یا ضرورت کی خبر ہمیں فوراً دینا۔ عارف نے کہا''ابو مجھے کلاس کی دیر ہورہی ہے.....پھر.....بات ہوگی.....انشاء اللہ .....السلام علیکم.....اللہ.....حافظ.....۔''فون ہاتھ میں لیے کچھ لمحوں تک دونوں وہیں کھڑے رہے۔عارف کے جملوں کی بازگشت جیسے گونج رہی تھی.....''اچھا..... بیگم.....مجھے ناشتہ دو۔میں بھی چلوں۔''

شام کو دفتر سے آنے کے بعد وہ اسی طرح آرام سے کرسی پر بیٹھے تھے کہ فون کی رنگ ہوئی۔انہوں نے فون اٹھا کر Caller کا نام دیکھا۔''بیگم عارف کا فون ہے''۔نجمہ کو آواز دے کر فون رسیو کرلیا۔''ہیلو.....بیٹا.....عارف!!''آپ کون بول رہے ہیں''؟ ادھر سے آواز آئی۔نجمہ بھی اب تک پاس آکر اسپیکر پر آواز سن رہی تھیں۔

''میں فرید اکرم.....بول.....رہا ہوں.....عارف کا فادر Father''۔''آپ کون.....اور عارف کہاں.....ہے؟''

''دیکھئے میں اس کے کالج سے پروفیسر رام چندرن بول رہا ہوں۔اچانک عارف کی طبیعت بگڑ گئی ہے۔ہم اسے اسپتال لے جارہے ہیں۔

''آپ عارف سے میری بات کرائیے''۔ان کے لہجے میں کرختگی در آئی تھی۔ نجمہ کی آنکھیں حیرت سے پھٹی ہوئی تھیں۔

''دیکھئے.....وہ اس وقت آپ سے بات کرنے کی Position میں نہیں ہے۔میرا خیال ہے کہ آپ کو یہاں آنا چاہیے۔اور فون کٹ گیا۔ان کے پیروں کے نیچے

سے زمین یقیناً سرک گئی تھی۔انہوں نے فوراً Call back کی۔فون نہیں اٹھا ..... دوبار..... تین..... بار..... چار..... آخر فون ان کے ہاتھ میں لرزنے لگا۔ اس کے باوجود وہ بار بار کوشش کرتے رہے۔اب switch off بتانے لگا۔اب تک آنکھوں سے آنسو بھی جاری ہو چکے تھے۔نجمہ کا بھی برا حال تھا۔انہوں نے کالج انتظامیہ کو فون ملایا۔بڑی مشکل سے وہاں فون تو اٹھا مگر کوئی خاطر خواہ جواب نہیں ملا۔وہ جاننا چاہتے کہ ہوا..... کیا ہے..... میرے..... عارف کو.....؟ نظر کے سامنے ایسے خدشات تیر رہے تھے جن کے نام بھی ذہن سے جھٹک دیتے۔اللہ اپنے حفظ وامان میں رکھے۔ چولیں فرید میاں کی درک گئیں تھیں۔پیروں پر جسم کا بوجھ اٹھانے کی طاقت بھی جیسے ختم ہو رہی تھی۔سامنے ایک ماں بھی حواس باختہ سی کھڑی تھی۔انہیں اپنے جذبات پر بہت قابو رکھنا تھا۔''بیگم..... ہمیں ابھی نکلنا پڑے گا''۔کہتے کہتے آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔کسی طرح بیٹی کو فون کیا۔وہ اسی شہر میں تھی۔تھوڑی ہی دیر میں شوہر کے ساتھ ایک چھوٹا سا بیگ لے کر آ گئی۔بیٹی کو دیکھتے ہی ماں کا اتنی دیر سے روکا ہوا صبر وضبط کا بند ٹوٹ کر بہہ نکلا۔وہ پچھاڑے مار کر گر پڑیں۔

داماد نے ریل کی تفصیلات معلوم کیں اور تتکال میں E.Ticket بک کرا دیا۔ پرنٹ بھی مل گیا۔دو گھنٹے بعد گاڑی تھی۔سفر کی کچھ تیاری تو کرنی ہی پڑتی ہے،سفر چاہے جس نوعیت کا ہو۔داماد نے ٹکٹ کے متعلق انہیں بتا دیا اور ساتھ میں یہ بھی اطلاع دے دی کہ آپ لوگ پیسوں کی فکر نہ کریں۔پیسے میرے پاس ہیں اور A.T.M. بھی ہے۔

تمام رات کا سفر طے کر کے وہ وہاں پہنچ گئے۔رات بھر چاروں میں سے کوئی نہیں سویا۔سب نظریں بچا کر ایک دوسرے کا جائزہ لے رہے تھے۔خاموشی کا اس قدر شور زندگی میں ایک آدھ بار ہی سننے کو ملتا ہے۔لگ رہا تھا جیسے وہ برسوں سے ٹرین میں سوار ہیں اور

ریل کہیں گہری سرنگ میں پھنس گئی ہے۔

سورج طلوع نہیں ہوا تھا مگر آمد کی اطلاع آ گئی تھی اور اسی کے ساتھ گاڑی پلیٹ فارم سے لگ گئی۔وہ گرتے پڑتے باہر نکلے اور تقریباً دوڑتے ہوئے اسٹیشن سے باہر آئے ۔ٹیکسی والے سے کالج کا نام لیا۔اس نے دو سو روپئے مانگے۔وہ لوگ دروازے کھول کر اندر رہوئے۔بھڑاک سے دروازے بند ہوئے اور بجلی کی سی تیزی سے گاڑی سڑک پر دوڑنے لگی۔فرید میاں نے ڈرائیور سے درخواست کی..... ''بھیا! تم جتنی جلدی ہو سکے ہمیں پہنچا دو۔ہم تمہیں اور پیسے دے دیں گے۔'' یہ سن کر اس نے رفتار اور بڑھا دی۔معاملے کی نزاکت وہ بھانپ گیا تھا اور واقعی میں بہت کم وقت میں انہیں کالج کے اندر پہنچا دیا۔اس نے زائد پیسے یہ کہہ کر واپس دیے..... ''نہیں صاحب..... آپ لوگ کسی پریشانی میں لگ رہے ہیں.....۔'' اور وہ گاڑی لے کر نظر سے اوجھل ہو گیا۔اس وقت کسی اور کے بارے میں سوچنے کا وقت تھا اور نہ محل۔دروازے پر خاصی تعداد میں پولس کا عملہ نظر آیا۔ خدشات کے سائے بڑے ہونے لگے۔وہ لفظ جن سے وہ شام سے ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کر رہے تھے،ایک پولس افسر نے قریب آ کر ان کے کان میں پگھلے شیشے کے ساتھ انڈیل دیا..... ''آپ..... عارف..... کے.....؟''

''ہاں..... ہاں..... میں باپ..... ہوں۔یہ ماں..... اور یہ بہن بہنوئی ..... عارف کہاں..... ہے.....؟''

''He is no more وہ اب اس دنیا میں نہیں ہے۔اس نے دوپہر تین بجے خودکشی کر لی''۔افسر کی آنکھیں بھی نم ہو گئی تھیں۔فرید اور نجمہ تو گر ہی پڑے۔رو رو کر بُرا حال تھا۔مجھے میرے بچے کے پاس لے چلو'' وہ اب دہاڑے مار کر رو رہے تھے۔کالج کا عملہ بھی موجود تھا۔طالب علم بھی کثیر تعداد میں Campus میں نظر آ رہے تھے۔ایک

www.urduchannel.in

سوگواری کا ماحول پوری فضا پر قائم تھا۔ کچھ دیر میں انہیں اس اسپتال لے جایا گیا جہاں عارف کی لاش رکھی تھی۔ رات میں ہی اس کا پوسٹ مارٹم ہو گیا تھا۔ ساری رپورٹز اور ضروری کاغذات پولس نے ان کے حوالے کر دیے۔ بہت دیر بعد فرید میاں کے ہونٹوں میں جنبش ہوئی..... ''ایسی..... کیا..... وجہ تھی..... جو اسے خودکشی کے لیے مجبور ہونا پڑا۔''

پولیس افسر مسلمان تھا۔ اس نے بتایا کہ ابھی تک کی تفتیش میں جو نتائج سامنے آئے ہیں وہ بتاتے ہیں کہ وہ پڑھائی کے بوجھ سے ڈپریشن میں تھا۔ پچھلے سمسٹر میں اس کا ایک پرچہ خراب ہو گیا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ ڈسٹرب تھا۔ ہم نے اس کے دوستوں سے بھی بات کی ہے۔ وہ بہت اچھا لڑکا تھا مگر ایسے اداروں میں خودکشی تو پڑھنے ہی والے کرتے ہیں چوں کہ مستقبل کے بارے میں والدین کی توقعات بہت زیادہ ہو جاتی ہیں.....۔'' وہ بہت رُک رُک کر بول رہا تھا۔ اور لوگوں کے پاس جو بھی معلومات تھیں سب انہیں بتا رہے تھے۔ سب میں یہ بات مشترک تھی کہ عارف بہت ذہین، حساس اور سنجیدہ لڑکا تھا۔ اتنے ذہین لوگ ڈپریشن میں آ ہی جاتے ہیں۔ رونے والوں کے پاس آنسو ختم ہو گئے۔ کالج اور پولیس کی تمام کاغذی کاروائی سے نمٹ کر اب انہیں واپس ہونا تھا۔ ایک ٹیکسی کا بندوبست کیا گیا اور وہ ایک بڑے تعلیمی ادارے سے والدین کا روشن خواب برف کی سِلّی پر لٹا کر واپس لوٹ گئے۔

لاش جب اپنے شہر پہنچی تو جس نے سنا ان کے گھر کی طرف دوڑ پڑا۔ ذرا ہی دیر میں وہاں جمِ غفیر نظر آنے لگا۔ کیا اپنے، کیا..... غیر..... سب کی آنکھیں نم تھیں۔ نجمہ تو بالکل سکتے کے عالم میں ایک کونے میں پڑی ہوئی تھیں۔ وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا۔ آخری رسومات بھی ادا ہو گئی۔ جنازے میں جیسے پورا شہر امڈ آیا ہو۔ گھر کے در و بام میں اگربتی، لوبان اور کافور کی مہک پھیلی ہوئی تھی۔ رشتے اور تعلق کے لحاظ سے وقت دے کر آگے پیچھے تمام لوگ رخصت ہو گئے۔ فرید اکرم کا وہ گھر جو ایک ہفتہ پہلے خوشیوں کا گہوارہ ہوا کرتا تھا

آج ایک اجڑا، بے رونق، ویران مکان میں تبدیل ہو گیا تھا۔ ایک ہفتہ میں فرید اور نجمہ برسوں کے بیمار نظر آنے لگے تھے۔ آنکھوں کے اردگرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔ گال بھی پچک گئے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کو اب تسلی و تشفی نہیں دے رہے تھے۔

ایک اور شام زوال کے لائے تھی۔ سورج رخت سفر سمیٹ رہا تھا، سیارے، سماوات اپنی گردش میں تھے۔ اس گھر کے علاوہ کہیں کسی پر اب کوئی فرق نظر نہیں آ رہا تھا۔ دونوں صحن میں کرسیوں پر آمنے سامنے خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ وقفے سے ادھر ادھر دیکھ لیتے اور پھر آسمان کی طرف نظر اٹھ جاتی۔ اچانک فرید میاں کے ہونٹوں میں جنبش ہوئی۔ ''نجمہ..... وہ..... دیکھو..... اپنا..... امرود..... کا..... پیڑ.....۔''

نجمہ نے آہستگی سے گردن اس طرف گھمائی..... کچھ وقت ضرور لگا مگر ان کی بھی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ خشک ٹہنیوں کے ساتھ ایک موٹا سا تنا زمین میں دھنسا ہوا تھا۔ اسے دیکھ لگ رہا تھا کہ شاید اس پر کبھی ایک ہرا پتا بھی نہیں نکلا۔ جیسے کسی نے اس کی جڑ میں تیزاب ڈال دیا..... ہو.....؟''

❁❁❁

www.urduchannel.in

دو پیر کا گھوڑا

جانے کتنی دیر ہوگئی تھی اسے ٹک ٹکی لگائے چھت کو گھورتے ہوئے ۔اب تک جانے کتنے آنسو تکیہ میں جذب ہو چکے تھے ۔اس کے علاوہ بھی بہت سی چیزوں کا اعداد وشمار اُس کے پاس نہیں تھا۔یاد تھا تو صرف یہ کہ بیس برس ہو گئے تھے اس شہر میں آئے ہوئے بلکہ یہ منحوس پیشہ اختیار کیے ہوئے۔

پیسے کے عوض اپنا جسم بیچنے والا وہ شہر میں اکیلا نہیں تھا مگر اس کی حکایت شاید دوسروں سے مختلف تھی ۔شروع میں جب وہ یہاں آیا تھا تب بہت کم لوگ تھے لیکن وقت کے ساتھ تعداد اتنی بڑھی کہ جس کام کا اعتراف مشکل تھا،افتخار کا شائبہ ہونے لگا۔وقت کے تغیر کی یہ سفاکیت بھی اسے اکثر وبیشتر افسردہ کر جاتی۔اسے اپنے دھندے سے اب کوئی شرم تھی نہ عار۔سب کچھ زندگی کا حصہ بن گیا تھا۔اس سے نجات کا خیال بھی اس کے ذہن میں نہیں آتا۔اگر چہ اس کے لیے بہت سی چیزوں کے معنیٰ ابھی نہیں بدلے تھے۔جسمانی اور ذہنی اذیت اسی وجہ سے اوروں سے زیادہ بڑھی تھی باوجود اس کے افراد کا راستہ اس نے خود ہی بند کر دیا تھا بلکہ تالا ڈال دیا تھا۔

اپنے اس روپ کے لیے وہ سب سے زیادہ قصوروار اپنی ماں کو ٹھہراتا۔خلوت کے اس لمحوں میں جب وہ اپنے بارے میں سوچتا ایک گول مٹول سا آٹھ نو برس کا بچہ فراک پہنے ہوئے ماضی کے در ومحرابوں سے جھانکتا ہوا نظر آتا۔

اس بچے کا نام ببلو تھا اور اپنے پانچ بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا۔ماں کو ایک عدد لڑکی کی خواہش تھی جس کی پاداش میں اس کے دو تجربے ناکام ثابت ہو چکے تھے۔ببلو کے ہونے کے بعد اس نے اپنی خواہش کا گلا گھونٹ دیا اور ظاہری طور پر اسے لڑکی بنا دیا۔کان تک چھدوا دیے۔ایسی خوبصورت فراکیں آتیں کہ لوگ پوچھے بغیر نہ رہ پاتے۔''اے بچی کہاں سے خریدی۔کتنے کی ملی۔وغیرہ وغیرہ۔؟''

ببلو جب تھوڑا بڑا ہوا۔چیزوں کو بہتر طور پر سمجھنے لگا تو پہلا اعتراض فراک پہننے پر کیا مگر اماّں کے آگے اس کی ایک نہ چلی۔انہوں نے تاویل پیش کی کہ ساری زندگی پینٹ شرٹ تو پہننا ہی ہے ابھی فراک بری نہیں لگتی۔کچھ دن اور پہن لے۔میری خاطر۔اور وہ پسیج گیا۔

دوستوں میں اس کی الگ ہنسائی ہوتی۔وہ اسے ببلی کے نام سے پکارتے۔وہ سب سے لڑ نہیں سکتا تھا البتہ اماں سے شکایتیں ضرور کرتا۔ماں ان سب کو تنبیہ کرتیں۔ممتا کے نشے میں چور انہوں نے کبھی کسی اور پہلو پر غور ہی نہ کیا یا کیا بھی ہو تو منفی پہلو اس طرح سامنے نہ آئے۔

دھیرے دھیرے فراک کے اثرات اس پر مرتب ہونے لگے۔لڑکوں سے کنارہ کشی کر کے وہ لڑکیوں کے ساتھ رہنے لگا۔لڑکیوں کو بھی اس کے قریب میں خاص لطف آتا وجہ دونوں کو نہیں معلوم۔حالاں کہ مذاق بھی اڑایا جاتا پر اُسے ناگوار نہیں گزرتا بلکہ اندر کہیں خواہش ہوتی کہ وہ اسے اسی طرح چھیڑتی رہیں۔گدگدی کا سا احساس ہوتا۔جب وہ گیارہ

بارہ سال کا ہوا بیشتر لڑکیوں نے اپنے والدین کے کہنے پر اس سے ترک تعلق کرلیا۔ حالاں کہ اس نے پتلون پہننا شروع کر دیا تھا پر اسے یقین اب بھی نہ ہوتا۔ لگتا کہ وہ ننگی ٹانگوں کے ساتھ کھڑا ہے۔ گلی محلے اور اسکول میں وہ جہاں کہیں بھی ہوتا لوگوں کی نگاہ کا مرکز رہتا ۔ غیر شناسا اشخاص کو بھی نسوانی جھلک بالکل واضح نظر آتی غرضیکہ ہر جگہ تضحیک ہوتی۔ پڑھائی سے بھی من ایک دم اُچاٹ ہو گیا تھا۔ اپنی ذات میں اس قدر سمٹا کہ بالکل تنہا ہو گیا۔

عارف بھائی کی شادی میں وہ واقعہ پیش نہ آتا تو شاید زندگی کا ڈھب کچھ اور ہوتا ۔ گھر شادی کے ہنگاموں سے بھرا ہوا تھا۔ اس دن رت جگا تھا۔ ڈھولک کی تھاپ پر عروسی گیت گائے جا رہے تھے۔ ہر طرف مہندی لگے ہاتھ۔ دو تین بجے تک وہ شور غل رہا کہ کسی کو کچھ ہوش نہیں رہا۔ تین بجے کہیں جا کر سونے کا پروگرام بنا۔ ایسی افراتفری میں جب پورا گھر مہمانوں سے بھرا ہو، کون کس کی خبر گیری کرتا۔ جسے جہاں جگہ ملی پیر پسار لیے۔ وہ بھی ایک کونے میں جا گھسا۔ بتیاں بند ہو گئیں ۔ وہ گھر جو ابھی تھوڑی دیر پہلے شادی کے شادیانوں سے گونج رہا تھا، اب تاریکی اور سکوت اوڑھے محوِ خواب تھا۔ لوگ تھک کر اتنا چور ہو گئے تھے کہ لیٹتے ہی گہری نیند میں سو گئے۔ ابھی آدھا گھنٹہ ہی گزرا ہوگا کہ ببلو کی آنکھ کھل گئی۔ برابر لیٹے ہوئے آدمی نے اس کا پیجامہ اُتار دیا تھا۔ وہ بری طرح گھبرایا ہوا تھا۔ شاید خوف کی وجہ سے اس کی چیخ بھی نکل جاتی، اگر اُس آدمی نے اس کے منہ پر ہاتھ نہ رکھ دیا ہوتا۔ وہ معاملے کی نزاکت سمجھ پاتا اس سے پہلے وہ اسے بری طرح سے چومنے لگا۔ وہ ڈر کے مارے بری طرح کانپنے لگا۔ جب جب اُسے ببلو کے چیخنے کا خدشہ ہوا، اُس نے ہونٹ ببلو کے ہونٹوں میں پیوست کر دیے۔ احتجاج کا تو اسے موقع ہی نہ ملا۔ جب تک ہوش بحال ہوتے، آدمی غائب ہو چکا تھا۔ خوف و ہراس اُس پر اب تک طاری تھا۔ تھوڑی دیر بعد جب سانسوں کا توازن درست ہوا تو خیال آیا کہ اماں کے علاوہ یہ پہلا آدمی تھا جس نے اس کا مذاق نہیں اڑایا بلکہ اماں سے زیادہ پیار کیا گو کہ بدن میں درد بہت ہو رہا تھا۔

پہلی بار دو پاؤں کا گھوڑا وہ اُسی رات کو بنا تھا۔ اسے تو معلوم ہی نہیں تھا کہ آگے ابھی کون سا مرحلہ آنے والا ہے۔ جب کیف و مستی کے لمحات ایک نقطۂ عروج پر منجمد ہو جائیں گے، اس کی تو جان ہی نکل گئی تھی۔ درد و تکلیف کی وجہ سے جھر جھر آنسو بہہ رہے تھے۔ ببلو کو کافی دیر بعد یاد آیا تھا کہ جانے سے قبل ہمت افزائی کے کچھ جملے مڑے تڑے نوٹوں میں لپیٹ کر اس نے اس کے ہاتھ میں پکڑا دیے تھے۔

اس رات کی صبح کبھی نہیں ہوئی۔ آج بھی وہ اسی رات میں جی رہا تھا۔ دھیرے دھیرے اس کی شہرت بڑھی۔ جسے دیکھو اسے بلا لیتا۔ حسب حیثیت اس کے ہاتھ پر پیسے دھرتا اور چلتا کرتا۔

ببلو نے اس کاروبار شوق سے خاصے پیسے جمع کر لیے تھے۔ ہتک اور بدنامی اس کا مسئلہ نہیں تھا۔ یہ مشکل ماں باپ کو جھیلنی پڑ رہی تھی۔ اب تو صورت حال نا قابل برداشت ہو گئی تھی۔ ببلو کو وہ ہر ہر طرح سے سمجھا بجھا کر ہار چکے تھے۔ وہ کسی کے تھامے نہیں تھما۔ آخر کار باپ نے حکم دیا کہ اگر وہ اپنے رویے نہیں بدل سکتا تو یہ گھر چھوڑ دے، ہم اور بدنامی برداشت نہیں کر سکتے۔ وہ شاید ایسے ہی کسی حکم کے انتظار میں تھا۔ کسی سے کوئی سوال و جواب نہیں۔ خاموشی سے گھر چھوڑ دیا۔ آج اتنے برس گزر جانے کے بعد احساس ہوتا ہے کہ گھر چھوٹا کہاں ہے بلکہ گھر کے علاوہ سب کچھ چھوٹ گیا ہے۔ زندگی سے ایسا انتقام کب سوچا تھا اس نے۔

بیس سال بمبئی میں کیسے گزر رے؟ کہاں کہاں کی ٹھوکریں نہیں کھائیں ۔ اسے خوب اچھی طرح معلوم ہے۔ پلا ہاؤس، کماٹھی پورہ میں بھی رہا مگر وہ جگہ زیادہ راس نہیں آئی ۔ اپنے پیشے میں وہ انفرادی طور پر زیادہ کامیاب رہا۔ پیسہ حالاں کہ خوب کمایا پر جوڑ نہیں پایا

۔اب بڑھتی عمر کے نا معلوم اندیشے اسے خوف زدہ کرنے لگے تھے۔کسے معلوم آگے کیسا وقت آنے والا ہے۔اس لیے مستقبل کے لیے پیسہ ہاتھ میں رہنا ضروری ہے۔وقت کی رفتار کا اسے بخوبی اندازہ تھا۔اسی وجہ سے اس کی تشویش بڑھ رہی تھی۔

شیوخ کے بارے میں وہ عرصے سے کہتے آ رہا تھا کہ تین بیویوں کے باوجود اغلام بازی کا شوق رکھتے ہیں اور بہت زیادہ رکھتے ہیں۔اس کے عوض خطیر رقم ادا کرتے ہیں۔کئی بار ذہن میں وہاں جانے کا خیال آیا مگر سنجیدگی سے نہیں سوچا۔اگر چہ کئی عرب سے اس کے مراسم تھے۔وہ جب بمبئی آتے ببلو کو دو پیر کا گھوڑا ضرور بناتے۔اس زندگی سے وہ بری طرح اوب چکا تھا۔ہر شعبے میں ہمیشہ سے ہارنے کی عادت ناگواری کی حدوں کو پار کر کے اذیت ناک ہوتی جا رہی تھی۔کیا وہ کبھی ایک لمحہ کا بھی فاتح نہیں بن پائے گا۔جیت کبھی حاصل نہ ہوئی ہو، پر اُس کی لذت سے تو بہر حال وہ واقف تھا۔اس کے پاس ایک ساعت ایسی نہیں تھی جو جینے کا مقصد عبث ہونے سے روکتی اور تو اور ہرا یرا غیرا نتھو خیرا اسے دُھتکارتا پھٹکارتا رہتا۔غلیظ گالیاں سننے کو ملتیں۔رنڈی بھڑوؤں کی زندگی تو ایسی ہی ہوتی ہے۔وہ ہزار بار خود کو سمجھانے کی کوشش کرتا مگر کہیں ایک کانٹا سا چبھا محسوس ہوتا کبھی وہ زخم بن کر ٹیس دینے لگتا۔

جب آئینہ دیکھتا تو خیال آتا کہ چہرے کی چمک ماند پڑ گئی ہے۔اب تو نحوست سی پھیلتی جا رہی تھی۔پہلے جیسے حالات بھی تو نہیں تھے اب۔بہت سارے نئے لونڈے آ گئے تھے۔اس کی دکان بھی زد میں آئی تھی۔باہر جانے کا خیال انہیں اسباب سے فروغ پا رہا تھا اور پھر جلد ہی اس نے فیصلہ کر لیا کہ کچھ بھی ہو اُسے عرب جانا ہے۔دوڑ بھاگ کر پاسپورٹ بنوالیا۔ہر جگہ اس کے جاننے والے موجود تھے جس کی وجہ سے کوئی خاص دقت پیش نہیں آئی ۔رشوت کا ایک پیسا بھی نہیں خرچ کرنا پڑا۔بابو تو فیس لینے میں بھی تکلف کر رہا تھا۔شاید

اسے کسی نے بتا دیا ہو حرکات وسکنات نے چغلی کی ہو مگر وہ خوش تھا کہ اس کا کام بن رہا تھا۔

اب Travel والوں سے رابطہ قائم کرنا تھا۔بمشکل پندرہ روز گزرے ہوں گے کہ وہ شیخ آ گیا جس کا وہ مستقل گاہک تھا۔ببلو کو لگا کہ ستارے گردش سے نکل رہے ہیں۔شیخ کے سامنے تجویز رکھی تو اس نے فوراً قبول کر لی۔اُسے لگا کہ یہ آدمی دو طرح سے فائدہ مند ہوگا۔دو پیروں کا گھوڑا تو وہ ہے ہی خچر اور بنا دیا جائے گا۔

رخصت ہوتے وقت اس نے ببلو کو یقین دلایا کہ ایک ہفتے میں وہ ویزا بھیج دے گا۔جانے سے قبل اس نے اپنے ایجنٹ سے ببلو کا سامنا پھر کروا دیا تھا۔ایجنٹ نے چپکے سے اتنا ضرور پوچھا تھا کہ وہاں جا کر تم کرو گے کیا؟

''وہی جو یہاں کرتا ہوں۔''اس نے ڈھٹائی سے جواب دیا تھا۔وہ ہونّقوں کی طرح دیر تک ببلو کو دیکھتا رہا تھا۔

عرب کی زمین پر پہنچنے میں اسے زیادہ دیر نہیں لگی۔دس دن کے اندر ویزا آ گیا ۔تمام کاغذی خانہ پوری نمٹا کر وہ جہاز میں بیٹھ گیا۔

وہاں پہنچتے ہی اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی رہ گئیں۔وہ کہاں کے لیے بنا تھا اور کہاں ضائع ہو رہا تھا۔

چند دنوں ہی میں اجنبیت کا احساس ختم ہو گیا۔مانوس ہونے میں اسے زیادہ وقت نہیں لگا۔لحاظ یا تکلف اس کا مسئلہ کبھی رہا ہی نہیں۔شہرت کے ساتھ خریداروں کا حلقہ بھی بڑھا۔اپنے ملک میں جتنے پیسے وہ مہینوں میں کماتا تھا یہاں ایک رات میں ملتے بلکہ رات کی بھی کیا قید۔

جلد ہی چہرے پر رونق بھی لوٹ آئی۔وہ روز دو بار شیو کرتا۔اس کے کفیل نے بڑا ساتھ دیا۔وہ اٹھتے بیٹھتے اس کا شکر ادا کرتا۔ببلو کے دماغ میں یہ بات کبھی نہیں آئی کہ وہ

گدھے کا کام بھی اسی سے لیتا۔ وہ تو ایسا مگن ہوا کہ اور باتوں کا اسے کچھ ہوش ہی نہ رہا یا رہا بھی تو اس نے کوئی توجہ نہیں دی۔ جو کچھ وہ دے رہا تھا۔ حاصل اس سے زیادہ کر رہا تھا البتہ شکست کا احساس اکثر و بیشتر اپنی خوفناک صورت دکھا کر اسے ڈرا ہی جاتا۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ فتح کا خیال اس کے ساتھ ہی مٹی میں دفن ہو جائے گا۔ کمر جھکائی ہو یا نہ جھکائی ہو مگر ہر شخص کے سامنے نظر تو جھکانی ہی پڑی ہے بھلے ہی سامنے والے کو احساس نہ ہو پایا ہو۔ دلائل و منطق سے وہ دوسروں کو مطمئن کر سکتا ہے، اپنے آپ کو نہیں۔

دیکھتے دیکھتے ایک برس گزر گیا۔ اب وہ تھوڑی بہت عربی بولنے اور سمجھنے لگا تھا۔ خاصے پیسے بھی جمع ہو گئے تھے۔ زندگی بہت سکون سے گزر رہی تھی۔ نقدی کے علاوہ ڈھیروں تحائف اس کی مشاقی اور تجربوں کی نذر کیے جا چکے تھے۔

ایک روز وہ بازار میں گھوم رہا تھا۔ کار میں بیٹھے ایک شیخ نے اشارے سے اپنے پاس بلایا۔ عربی میں جانے کیا آئیں بائیں بولا اور دروازہ کھول دیا۔ حالاں کہ اس وقت اس کا قطعی موڈ نہیں تھا مگر اس پیشے میں موڈ و مرضی کا اتنا دخل کہاں ہوتا ہے۔ وہ گاڑی میں بیٹھ گیا۔

دس منٹ کے بعد گاڑی ایک پورٹکو میں رکی۔ وہ ببلو کو بڑی محبت کے ساتھ ایک آفس میں لے گیا۔ آفس کے پیچھے حصے میں ایک شاندار بیڈ پڑا ہوا تھا۔ اسے قدرے حیرت ہوئی۔ بستر اپنی کہانی آپ کہہ رہا تھا۔ فریج سے اس نے ڈھیر سارے پھل اور مشروب کے ٹن باہر نکالے۔ ببلو سے کھانے کا اشارہ کر کے وہ باتھ روم میں گھس گیا۔ دو منٹ بعد نہا کر باہر آ گیا۔ بدن پر صرف چڈھی باقی تھی۔ اس نے ببلو سے بھی غسل کرنے کو کہا۔ پہلے تو وہ سمجھ ہی نہ پایا، پر اشارے کی زبان آسانی سے سمجھ میں آ جاتی ہے۔ ببلو کہ لگا یہ آدمی دوسروں سے مختلف ہے۔ ورنہ آج تک کبھی کسی نے نہانے کی تجویز نہیں رکھی۔

ذرا سی دیر میں وہ تازہ دم ہو کر باہر آ گیا۔ شیخ نے بغیر کسی حجاب یا تمہید کے اسے بستر میں آنے کی دعوت دی۔

دس منٹ تک معاملہ بوس و کنار تک سمٹا رہا اور پھر اچانک بالکل غیر متوقع طور پر شیخ اس کے سامنے دو پیروں کا گھوڑا بن گیا۔ حیرت و استعجاب سے وہ شیخ کو دیکھتا ہی رہ گیا۔ عرب میں سب چار پیر کے گھوڑے نہیں ہوتے۔ یہ اُسے آج ہی معلوم ہوا تھا۔

وہ چابک لے کر گھوڑے پر سوار ہو گیا اور اس رفتار سے دوڑایا کہ ذرا ہی دیر میں گھوڑا رخش ہو گیا۔ قدرے توقف کے بعد تھک ہار کر جب دونوں ادھر اُدھر گرے تو دم سادھنے میں کچھ دیر لگی۔ دونوں بری طرح ہانپ رہے تھے۔ سانسوں کا زیر و بم جب معمول پر آیا تو شیخ نے پانچ پانچ سو ریال کے دو نوٹ اس کی طرف بڑھائے۔ ایک بار اُس نے ریال کو اور غور سے دیکھا۔ پھر اس کے ہونٹوں میں جنبش ہوئی۔ ''اپنی برادری والوں سے میں پیسے نہیں لیتا۔'' شیخ اس کی بات نہیں سمجھ پایا۔

''ایش کلام اِنتا؟'' اس نے خود ہی سوال کیا۔

"Do You Know English?"۔ ببلو نے جواب کے عوض سوال داغا۔

"Something..Something"

"I Can't get money from our community"

رُک رُک کر ببلو نے اپنا جملہ پورا کیا۔ پتا نہیں شیخ سمجھ پایا کہ نہیں ہونق بنا وہ ببلو کو دیکھ ضرور رہا تھا۔ ببلو نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے ریال میز پر رکھے اور کالر کھڑے کر کے کمرے سے باہر ہو گیا۔

❁❁❁

www.urduchannel.in

گول

اُس کا نام تو آر کے شکلا ہے لیکن وہ شکلا جی کے نام سے مشہور ہے۔ اتنے سے ہی اس کی تشخیص ہو جاتی ہے۔ شکلا تو اور بھی کئی ہیں مگر ان کے ساتھ جی کا اہتمام نہیں ہوتا۔ کبھی ضرورت پڑنے پر آر کے کا اضافہ ہو جاتا ورنہ شکلا جی تو ہیں ہی۔ شکلا کا اصول اور پورا نام کیا ہے؟ یہ شاید کسی کو نہیں معلوم۔ لوگوں کو تو یہاں تک شبہہ ہوتا کہ پتا نہیں خود شکلا کو بھی آر کے کا مطلب معلوم ہے یا نہیں۔ خیر، وہ ایک سرکاری دفتر میں بڑے بابو کے عہدے پر فائز ہے۔ نوکری اب بہت زیادہ دن کی نہیں بچی ہے۔ غالباً ڈیڑھ یا دو سال، لیکن اس کی عادتوں اور طور طریقوں میں اس کے اثرات کا شائبہ بھی نہیں جھلکتا۔ وہ ایک بہت تیز دماغ رکھنے والا شخص ہے۔ بے خوف، کام چور اور جی بھر کے رشوت لینے والا۔ ساتھ ہی کمزوریوں کو دبا کر رکھنے والا۔ اس کی دبنگئی سے لوگ ڈرتے تھے۔

کچھ باتیں تو آج تک کسی کی سمجھ میں نہیں آئیں۔ مثلاً وہ افسر کو کیسے اور کیوں کر اپنے دام میں لے لیتا تھا۔ ایسی کون سی گھٹی تھی جسے پلاتے ہی وہ اس کے تابع ہو جاتے۔

شکلا کے اثر و رسوخ کا یہ عالم تھا کہ کوئی سامنے اونچی آواز میں بات کرنے کی جسارت نہیں کر پاتا۔ لوگوں کو معلوم تھا کہ شکلا جی سے براہ راست دشمنی ان کے لیے خسارے کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ پیٹھ پیچھے تو ہر کس و ناکس اسے گالیاں بکتا مگر سامنے سب کی گھگھی بندھ جاتی۔ براہمن ہونے کی وجہ سے گاڑی سے اترتے ہی پاؤں چھونے والوں کا جو سلسلہ شروع ہوتا وہ شام کو گاڑی پر سوار ہونے تک قائم رہتا۔ دل چاہے یا نہ چاہے قدم بوسی تو کرنی ہی ہوگی ورنہ فوراً ہی اس کا تاوان ادا کرنا ہوتا۔ بندے کو کمائی والی سیٹ سے ہٹانے کا حکم نامہ جاری ہو جاتا۔ دبدبہ قائم رکھنے کے لیے آئے دن کچھ نہ کچھ شرارتیں کرتا ہی رہتا۔

دفتر کے احاطے میں داخلے سے وقت رخصت تک منہ پان مسالے سے بھرا رہتا۔ صبح آنے میں دو گھنٹے کی تاخیر ہوتی مگر شام کو جانے میں اس کا ازالہ کر دیا جاتا۔ وجہ کام کی زیادتی نہیں تھی۔ ویسے بھی اسے خود کون سا کام کرنا ہوتا۔ کراس لگانے کے لیے ہی قلم کھلتا۔ دفتری کام کے لیے ایک پرائیوٹ لڑکا رکھا ہوا تھا۔ اس کے پیسے بھی اسی سے دلواتا جس کا کام ہوتا۔

شام کو جب اکثر لوگ دفتر سے نکل جاتے تو شکلا کا اصل شغل شروع ہو جاتا۔ دو چار دوستوں کے ساتھ شراب نوشی کا آغاز ہوتا۔ کمپیوٹر میں سی ڈی وغیرہ ڈال کر فحش و بے ہودہ فلمیں دیکھی جاتیں اور باقاعدہ عورتیں بھی فراہم ہوتیں.....۔

اب اس خیال کی اہمیت بھی ختم ہوگئی کہ کسی سرکاری آفس میں..... کون سی..... عورتیں..... کیسے..... کیوں.....؟ دیگر اشیا کی مہنگائی چاہے جتنی بڑھی ہو عورت کے بدن کی ارزانی ویسی ہی ہے۔ دو میزوں کو جوڑ کر ایک کر لیا جاتا اور پھر باری باری سے سب میزوں کی بھی چولیں کمزور کرنے کے لیے آگے آجاتے۔

ہر بری چیز شکلا کی کمزوری تھی۔ خواہ وہ شراب ہو..... رشوت ہو..... یا دوسری

www.urduchannel.in

عورتوں سے جسمانی تعلقات ۔وقت نے اس کے لیےاورآسانیاں پیدا کر دی تھیں۔ پہلے موج مستی کے لیے باہر سے لڑکیاں اور عورتیں لائی جاتیں ۔اب اس کی ضرورت بھی نہیں پڑتی ۔سوداسلف بیچنے والی کچھ حالات سے مجبور،ضرورت منداور کچھ اس کی آڑ میں پیشہ ور عورتیں۔سب کے سب دوپہر کے بعدنمودار ہوتیں۔جولوگ ان کی حقیقت سے واقف نہیں تھے،ضرورت نہ ہونے کے باوجودترس کھا کرجھولے کا کچھ سامان خرید لیتے۔شکلا جیسے اصل خریداروں سے پانچ بجے کے بعد ملاقات ہوتی۔کہاں کس وقت پہنچنا ہے ،یہ دشواری موبائل نے آسان کر دی تھی۔

محکمہ میں شکلا کی اہمیت اور طاقت پر لوگ رشک کرتے۔حالاں کہ حسد کرنے والوں کی تعداد بھی کچھ کم نہ تھی مگر کوئی اس کا کچھ بگاڑنے کی حیثیت نہیں رکھتا تھا اور یہ بات شکلا کو بھی اچھی طرح معلوم تھی۔اس نے اپنے جبر کا خیمہ اتنی مضبوطی سے گاڑا تھا کہ تیز ہوائیں تو کیا چھوٹی موٹی آندھیاں بھی اسے زمین بوس کرنے میں ناکام تھیں۔ایک فاتح اور کریہہ مسکراہٹ ہمہ وقت اس کے چہرے پر طاری رہتی ۔کمزور اور شریف النفس لوگ اپنی جائز بات کہنے میں بھی ڈرتے تھے بلکہ تھرتھری چھوٹتی تھی۔کون جانے کس بات کے کیا معنی اخذ کر لے؟

شکلا گھر میں بھی بڑا بابو ہی واقع ہوتا۔مزاج میں ذراسی تبدیلی یہاں بھی دیکھنے کو نہیں ملتی بلکہ گھر میں وہ کچھ اور زیادہ ہی سخت ہو جاتا۔شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ یہاں وہ حاکم بھی ہے۔کوئی فیصلہ صادر کرنے کے لیے کسی افسر کی ہاں حضوری نہیں کرنی پڑتی ۔ویسے بھی زندگی کے بارے میں اس کا نظریہ یہی تھا کہ رعب داب اور سختی سے سب قابو میں رہتے ہیں اور وہ اپنے نظریے کی عملی تائید کر رہا تھا۔شکلا کا سب سے زیادہ عتاب اس کی بیوی نے جھیلا تھا۔وہ گاؤں کی سیدھی سادی،ان پڑھ عورت تھی۔بچپن میں ہی اس کی شادی ہوگئی

۔پندرہ کی ہوتے گونا بھی ہوگیا اور عمر کے سولہ برس پورے ہونے سے قبل پہلے بچے کی ولادت بھی ہوگئی۔اس کا نام رادھا تھا مگر اُسے بھی اس نام سے جاننے والے کم ہی لوگ تھے۔منی منی کہتے،آخرکار یہی نام پڑ گیا۔والدین تو منیا کہہ کر پکارتے۔

منی کے باپ ویدھ تھے اور یہ کام ان کے یہاں کئی پیڑھیوں سے چلا آرہا تھا۔باہر والا ایک کمرہ انہوں نے اس کے لیے مختص کر دیا تھا۔گاؤں کے اکثر لوگ چھوٹے موٹے علاج کے لیے ان سے رجوع کرتے۔منی نے آنکھ کھولی تو جڑی بوٹیوں اور چورن کی مہک اپنے آس پاس محسوس کی۔

درجہ پنجم تک سرکاری پاٹھ شالا میں تعلیم حاصل کی ۔تعلیم...... کیا......بس حرف شناسی ہوگئی تھی اور باپ کے لکھے نسخوں کی پڑیا باندھ لیتی تھی۔اس کے باپ اگر چہ اسے آگے پڑھانا چاہتے تھے مگر کہنہ روایات کے دباؤ میں وہ چاہ کر بھی اپنا مقصد پورا نہیں کر سکے۔منی نیم حکیم تو ہوگئی تھی مگر کسی جان کے لیے خطرہ نہیں بنی تھی ۔گھر کے کسی فرد کو کھانسی ،بخار یا ایسی ہی معمولی بیماری ہوتی تو منی منہ کھول کر پڑیا ڈال دیتی اب تو انکار کی گنجائش بھی ختم ہوگئی تھی۔حیرت انگیز طور پر انہیں دوا سے شفا ہوتی غرضیکہ منی کو ضرورت بھر کی حکمت آ گئی تھی۔

منی نے سات بچے پیدا کیے۔جن میں سے دو نہیں جی سکے۔خاندانی منصوبہ بندی کے شہری طور طریقوں سے نہ وہ بہت واقف تھی اور نہ یہ حیثیت تھی کہ قدغن سے متعلق کچھ اشارے کنایہ بھی کر سکے۔ساس،سسر اس کے ساتھ ہی رہتے تھے حالاں کہ وہ اس کے ذاتی معمولات میں دخل نہیں دیتے۔گو کہ ان کی وجہ سے دن بھر گھونگھٹ ڈالے رکھنا پڑتا ۔بعض اوقات وہ اُوب جاتی مگر اپنے کمرے کے علاوہ ان کی موجودگی میں پلو گرا ہی رہتا۔شوہر کے لیے جسمانی خواہشات پورے کرنے کا وہ ایسا ذریعہ تھی کہ جب چاہے،سوتے ،

www.urduchannel.in

جاگتے ،وہ اسے اپنی طرف گھسیٹ لے۔اس کا کام صرف اتنا تھا کہ بلاوز کے ہُک یا بٹن کھول دے اور ساڑی ، پیٹی کوٹ اوپر سرکا دے۔شراب کے بھکوں میں لپٹے بوس وکنار ..... جس کی وجہ سے کراہیت ہوتی اور کئی بار تو لگتا کہ شاید قے ہو ہی جائے گی۔ان ساعتوں میں وہ کس کرب واذیت سے گزرتی ،اس کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔شوہر کے لیے یہی سب راحت جاں تھا۔عرصہ ہوا اس کے سامنے اپنا کوئی مسئلہ اب رکھتی ہی نہیں۔اسے معلوم تھا کہ لب پر کوئی شکوہ کبھی آ گیا تو جسم پر خارجی چوٹیں بھی آئیں گی۔

ایک سرد جنگ جو شادی سے اب تک اس کے اندر جاری تھی اب شاید کسی نتیجہ کے قریب تھی۔چوبیس برس کے ہر لمحہ میں اس نے کبھی اپنی شکست نہیں محسوس کی۔وہ دیکھ رہی تھی کہ کسی کا جبر وظلم زیادہ ہوسکتا ہے یا اس کا صبر وتحمل۔اسی لیے وہ اپنی نظروں میں سرخرو تھی کہ ابھی اس کے صبر وضبط نے جواب نہیں دیا ہے۔لاکھ وہ اَن پڑھ ہے۔طور طریقوں کے معنی تو جانتی ہے۔ظالم ومظلوم کا فرق بھی بہت اچھی طرح معلوم ہے اسے۔استحصال اور حق تلفی کے ہجے اور قرأت بھلے ہی نہ معلوم ہوں مگر یہ جس چڑیا کے نام ہیں وہ تو اسے پتا ہی ہے اور شاید ہی اس سے بہتر طریقے سے کوئی اور جانتا ہو۔

شوہر کے لیے وہ صرف ایک بدن تھی..... عورت کا بدن..... ایک ایسا بدن کہ جب اسے اس کی ضرورت ہوتی ،کروٹ ادھر گھمالی جاتی ورنہ دوسری طرف منہ کیے ہوئے نشے میں ڈوبے گرتے سنبھلتے خراٹے جانے کب تک سنتی رہتی۔رات کی اس تاریکی سے صبح کے نمودار ہونے کا سراغ ملتا ہے۔وہ پو پھٹنے کے انتظار میں ڈری ،سہمی اپنے اندر سمٹی ہوئی بیٹھی ہے۔بچے اب بڑے ہوگئے تھے۔انہوں نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔بھلے ہی وہ باپ کے مقابل نہ کھڑے ہوسکے ہوں لیکن ان کی ماں نے کتنی مشکل زندگی گزاری ہے، یہ انہیں خوب اچھی طرح معلوم ہے اور یہی وجہ تھی کہ بچوں کا جھکاؤ شروع سے

ماں کی طرف تھا۔منی کو سرنگ میں یہی کرن تو نظر آ رہی تھی۔

پانچ بچوں میں تین لڑکے تھے اور دو لڑکیاں۔سب سے بڑا بیٹا اور اس کے بعد کی بیٹی دوسرے شہر میں رہ کر انجینئرنگ کی پڑھائی کر رہے تھے۔بیٹوں میں سب سے چھوٹا گڈو جو ہائی اسکول کی تیاری کر رہا تھا۔اپنی ماں کے ساتھ سب سے زیادہ وقت اسی نے گزارا تھا۔سب سے چھوٹا ہونے کی وجہ سے لاڈ پیار بھی اسے سب سے زیادہ ملا تھا مگر اور بھائی بہنوں کے مقابلے وہ ماں سے سب سے زیادہ قریب تھا۔اپنے لیے دو پیار کے میٹھے بول منی کو اسی کے منہ سے سنائی دیتے۔وہ برابر ماں کی ہمت افزائی بھی کیے رہتا۔پڑھائی کے علاوہ اسے سا کر Soccer کا بھی بہت شوق تھا۔شوق کیا جنون تھا صرف دیکھنے کی حد تک نہیں بلکہ کھیلنے کا بھی۔حالاں کہ اس کے لیے اسے آئے دن باپ کی جھڑکی سننی پڑتی۔اگر چہ اس شوق سے اس کی پڑھائی پر قطعی منفی اثر نہیں پڑ رہا تھا مگر باپ کو تو ڈانٹنے پھٹکارنے کے لیے بہانے کی ضرورت تھی.....اور بہانا بھی کیا.....؟ وہ تو اس کے بغیر بھی بے نقط شروع ہو جاتا۔جب زیادہ دن سکون سے نکل جاتے تو اسے فکر ہونے لگتی اور بس لعن طعن بکنے لگتا۔اس کی تاویل تھی کہ کھیلنا ہی ہے تو کرکٹ کھیلو، جس کی ملک میں قدر اور اہمیت ہے۔فٹ بال کو یہاں کون پوچھتا ہے؟ کسی چیز کا شوق اپنے آپ نہیں طے کرنا ہوتا ہے۔ایک دن باپ کے ڈانٹنے پر کچھ ایسا ہی جملہ اس کی زبان سے پھسل گیا تھا۔ظاہر ہے اس کی پٹائی ہونی تھی اور خوب جم کر اس نے بھڑاس نکالی..... سالا..... مجھے..... جواب دیتا ہے..... مجھ سے..... پیدا..... اور مجھے ہی چڑا رہا ہے..... اور بھی جانے کیا..... کیا.....؟ وہ تو گڈو کے دادا نے عین وقت پر آ کر اُسے بچا لیا۔ورنہ اس دن جانے کیا ہوتا۔باپ کے تئیں اس کے اندر نفرت بڑھتی ہی جا رہی تھی۔

چوبیس برس ہو گئے تھے اسے قطرہ..... قطرہ..... روتے..... اور مرتے

www.urduchannel.in

ہوئے۔اس قدر رونے کے سبب آنکھوں کے ارد گرد گہرے سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔وہ اکثر سوچتی کہ کیا ازدواجی زندگی ایسی ہوتی ہے لیکن اپنے آس پاس اور کسی کو اتنا بے بس ولاچار اس نے نہیں دیکھا تھا۔کیسا سخت جاں ہے کہ بچوں پر بھی رحم نہیں آتا۔اُنس ومحبت کے سارے سوتے اس کے یہاں خشک ہوگئے تھے۔اتنے ماہ.....و.....سال.....بعد میں بھی کوئی تبدیلی نہیں.....وہی.....لق.....و.....دق.....صحرا.....دور تک صرف ریت ہی.....ریت.....وہ اپنے بچپن کو یاد کرتی ہے۔وہ غیر معمولی خوبصورت تو نہیں تھی مگر شمار خوبصورتوں میں ہی ہوتا تھا۔تبھی تو رشتوں کی قطار لگی ہوئی تھی۔باپ نے سوچا کہ سرکاری ملازمت ہے۔شہر میں رہے گی تو منیا کی عاقبت سنور جائے گی۔کسی کو کیا پتا کہ کیسے.....سدھری.....وہ سوچتی کہ شاید یہ پچھلے جنموں کے پاپ ہوں گے مگر اس کی بھی تو کوئی حد ہوگی۔کئی بار ذہن میں خودکشی تک کا خیال آیا لیکن فوراً ہی جھٹک دیا۔بچے اسے زندہ رہنے کے لیے مجبور کیے ہوئے تھے۔

صبح کاذب کے وقت جو بستر چھوڑتی تو پھر دیر رات کو ہی جانے کا موقع ملتا۔دو سوتی دھوتیوں میں کئی کئی سال نکال دیتی۔کپڑوں کی یا کھانے پینے کی تنگی نہیں تھی مگر سجنے سنورنے کے لیے دل ہی نہیں چاہتا۔صبح اسنان کر کے ایک لپیٹ لیتی اور دوسری دھو کر الگنی پر ڈال دیتی۔سخت سردی کے موسم میں بھی منہ اندھیرے ٹھنڈے پانی سے ہی نہاتی۔عادت بھی تھی اور شاید کہیں لاشعور میں خود سے انتقام کے جذبے بھی ایسا کرنے کے لیے مجبور کرتے۔نحیف سا بدن بھی اتنا مضبوط ہوگیا تھا کہ کسی طبی بیماری کی گرفت میں ہی نہیں آتا۔اس بات پر وہ خیریت کے ساتھ افسوس بھی کرتی۔تیج، تیوہار بھی اس کے لیے عام دنوں کی ہی طرح تھے بلکہ ان دنوں میں تو کام اور بھی زیادہ بڑھ جاتا۔صرف کروا چوتھ والے دن نہ چاہتے ہوئے بھی اسے سجنا پڑتا۔یہ دن اس کے لیے کتنا اذیت ناک ہوتا ہے وہ کسی کو

کیا بتاتی۔اس دن تیار ہو کر بھی آئینہ کے سامنے نہیں جاتی۔بچپن کی یادیں تازہ ہو جاتیں۔حالاں کہ ان سے نجات تو درپن کے مقابل نہ جا کر بھی نہیں ملتی مگر دیکھنے کی بات اور ہوتی ہے۔گاؤں میں جب وہ تیار ہو کر شیشے کے سامنے خود کو نہارتی، چہرے کو شیشے کے اور قریب لے جا کر جانے کیا دیکھتی اور زیر لب مسکرا دیتی۔دوپٹہ ہٹا کر گدرایا ہوا بدن اور سینے کے اُبھار تک نظر آتے آتے خود سے شرما جاتی اور فوراً وہاں سے ہٹ جاتی۔کتنا عارضی وقت تھا وہ.....ماہ.....و.....سال کی دبیز تہوں میں سے جھانکتے کچھ چمکتے روشن خواب، جب کبھی اس کے ذہن میں اُبھرتے.....ایک ٹیس.....کسی خار کی چبھن جیسی اسے اور اداس کر جاتی۔کوئی کام نکال کر خود کو اس میں مصروف کرنے کی حتی الامکان کوشش کرتی ہر چند کہ اس کوشش میں کبھی کامیاب نہیں ہوتی۔اپنے ہاتھوں کو دیکھتی۔جھاڑو برتن کرتے کرتے اس کے خوبصورت ہاتھ، بھری صحت مند کلائیاں خشک ٹہنیوں کی طرح بے رونق ہو گئیں تھیں۔

کبھی کھانسی، بخار کے عارضے میں مبتلا ہوتی تو مانگے سے لائی ہوئی پڑیا بکسے سے نکال کر پھانک لیتی۔ایک پڑیا کبھی کارگر نہیں ہوتی تو کچھ وقفے کے بعد ایک اور ڈال لیتی اور بس جُٹ جاتی گھر گرہستی کے کبھی نہ ختم ہونے والے کاموں میں۔

اس کا گاؤں شہر سے بہت دور نہیں تھا مگر اس نے بنا دیا تھا۔اچھی بری خبروں پر تو جانا ہی پڑتا۔اس کے علاوہ بھیا دوج پر بھائیوں کو ٹیکا کرنے ہی آتی اور تبھی سال بھر کی اپنی ضرورت کی تمام چیزیں جو وہاں سے درکار تھیں، دوا کی پڑیوں سمیت اپنے جھولے میں ڈال لیتی۔باپ کے پاس بیٹھتی تو مزید بیماریوں کے متعلق ان سے باز پرس کرتی۔باپ یہ کہہ کر کہ ابھی تک تیرا یہ شوق ختم نہیں ہوا۔اس کے سوالوں کے اطمینان بخش جواب دیتے۔

منی اس بار گاؤں گئی تو پتاجی کے کمرے سے جنسی امراض کی کچھ کتابیں ساتھ

www.urduchannel.in

لے آئی تھی۔اس پر چڑھی گرد وغبار کی تہوں سے اندازہ ہوگیا تھا کہ پتا جی کو شاید اب یہ کتابیں دیکھنے کی ضرورت نہیں پڑتی اور پھر اسے کون سا ہمیشہ اپنے پاس رکھنی ہیں۔اسے جو معلومات درکار تھیں وہ یہاں اتنے کم وقت میں ممکن نہیں تھیں۔اس کا خیال تھا کہ اگلی بار جب وہ گاؤں آئے گی تو واپسی اسی جگہ پر رکھ دے گی اور اس نے ویسا ہی کیا بھی۔شہر پہنچ کر پہلی فرصت میں وہ کمرہ بند کر کے کتب سے مطلوبہ صفحات تلاش کرنے لگی۔آخری صفحات پر درج ایک سرخی پر نظر پڑتے ہی وہ ٹھہر گئی۔''نامردی کے اسباب اور دفاع کے طریقے'' جیسے جیسے وہ عبارت پڑھتی گئی چہرے پر خوشی اور اطمینان کے تاثرات اُبھرتے رہے۔دفاع کا اقتباس آنے سے پہلے اس نے کتاب بند کر دی۔

پچھلے ہفتے اس کے چاچا کے مرنے کی خبر آئی تھی تو وہ گڈو کو لے کر بس میں سوار ہوگئی۔شوہر سے پوچھا تھا تو اس نے کام کی زیادتی کا بہانا کر کے منع کر دیا۔وہ چاہتی بھی نہیں تھی شکلا اس کے ساتھ جائے۔وہ تو ویسے بھی گاؤں جانے کا موقع تلاش کر رہی تھی۔ کہیں نہ کہیں یہ ڈر بھی تھا کہ پتا جی کو ان کتابوں کی ضرورت پڑ ہی نہ جائے۔اس کا کام تو ہو ہی گیا تھا۔اب تو گاؤں جا کر وہ دوا بنانی تھیں۔یہ بات تو اسے بہت پہلے معلوم تھی کہ آیور وید کی دوائیں اگر شفا نہیں دیتی تو نقصان بھی نہیں کرتیں لیکن وقت کے ساتھ اس شعبہ میں بھی دیانت داری کا بھرم ٹوٹ گیا ہے۔بیش تر لوگ Pain killer کی گولیاں پیس کر جڑی بوٹیوں میں ملا کر فروخت کر رہے ہیں۔صحت پر اس کے منفی اثرات ان کا مسئلہ تھا بھی نہیں۔اب تو خود بھی ایسے لوگوں کی طرفدار تھی۔اس کے باوجود اتنے برس بعد بھی وہ شہر کے مزاج سے ہم آہنگ نہیں ہو پائی تھی۔اس کے لیے اس کے پاس ایک جواب تھا..... کوشش بھی تو نہیں کی۔

ایک ماہ قبل کی بات ہے، رات کے کسی پہر شکلا نے سوتے میں منی کو اپنی طرف

گھسیٹ لیا۔وہ ایکدم سے ہوئے اس حملے کے لیے قطعی تیار نہیں تھی۔وہ بری طرح ڈر گئی۔بدن بھی تقریباً کانپنے لگا تھا۔چند لمحوں میں جب ہوش وحواس کچھ درست ہوئے تو معاملہ پوری طرح سے اس کی سمجھ میں آیا۔بہت ہمت بٹور کر وہ اتنا ہی کہہ پائی..... کہ ..... آج ..... تیسرا ..... دن ..... ہے ..... ''۔''پہلا اور دوسرا تو نہیں ہے.....۔میں دیکھ رہا ہوں کہ اب تم روز ہی کوئی نہ کوئی ناٹک کرنے لگی ہو..... تو کیا میں اپنے مولک ادھیکاروں سے بھی ونچت ہو جاؤں۔''اس سے پہلے کہ وہ آگے کچھ اور کہتا، منی نے شکلا کا ہاتھ ٹٹول کر اپنے سینے پر رکھ دیا۔شکلا کو پتا بھی نہ چلا کہ کب اس نے بلاؤز کے ہک کھول دیے۔یخ بستہ جسم پر وہ وحشی کی طرح بھنبھوڑنے لگا۔وہ آنکھیں بند کیے اذیت اور کرب کو برداشت کرتی رہی۔اس کھیل میں اس کی دلچسپی ضرور اتنی تھی کہ دوا کا اثر اس کے سامنے آجائے۔تھوڑی دیر بعد معمول کے مطابق وہ کروٹ لے کر گہری نیند سو گیا۔منی نے پہلے اپنے کپڑے درست کیے پھر اپنے عزائم۔اس رات شوہر کے تئیں نفرت انتقامی جذبوں میں تبدیل ہوئی تھی۔اسی رات وہ کتنی دیر تک جاگتی رہی اسے خود بھی ہوش نہیں رہا۔

دوسرے دن ایک عورت اس کے پاس آئی۔اس کے ساتھ چار پانچ برس کا ایک لڑکا تھا۔وہ اسے نہیں جانتی تھی۔عورت نے اپنا نام نِشا بتایا اور کہا کہ وہ آپ سے کچھ بات اکیلے میں کرنا چاہتی ہے۔کسی حد تک وہ معاملہ کی نزاکت بھانپ گئی تھی۔وہ اسے اپنے کمرے میں لے گئی۔عورت نے رو رو کر اپنی روداد بیان کی۔منی خاموشی سے بے حس وحرکت اس کی باتیں بغور سنتی رہی۔نشا نے بتایا تھا کہ وہ دفتر میں دھوپ بتی وغیرہ بیچتی ہے۔اس کے شوہر کا انتقال ہو چکا ہے اس لیے اسے باہر نکلنا پڑا۔ایک دن شکلا کے پوچھنے پر اپنا دکھڑا اسے سنا دیا اور بس میں اس کے جھانسے میں آگئی۔شادی کا جھوٹا وعدہ کر کے

www.urduchannel.in

جسمانی تعلقات بنائے۔ یہ شبھم اسی کی اولاد ہے۔ ابھی تک تو خرچ کے پیسے دیتا رہا، اب وہ بھی منع کر دیا۔ منی کو اس سے ہمدردی ہوئی مگر وہ مدد کرنے کی اہل ہوتی تو جانے کب اس زنداں سے فرار ہوگئی ہوتی..... وہ تو اسے صبر و ہمت بھی نہیں دلا سکی۔ مجھے پتا ہے کہ آپ میری کچھ مدد نہیں کر سکتیں۔ بس میں آپ کو بتانا چاہتی تھی۔ وہ آنسو پونچھ کر لڑکے کا ہاتھ پکڑ کر چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد منی کو خیال آیا کہ چائے پانی تو کرا ہی دیتی یا بچے کے ہاتھ پر ہی کچھ دھر دیتی..... مگر اب کیا ہو سکتا ہے.....؟ رات میں بستر پر دوسری طرف کروٹ کیے لیٹے شکلا کو اس نے بتایا کہ نشا آئی تھی ..... بیٹے کو لے ..... کر..... شکلا ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور پھر نشا کو ماں بہن کی گالیاں دینے لگا۔ ساتھ ہی اس کی آوارگی اور بدچلنی کے قصے سناتا رہا۔ منی خاموش لیٹی رہی۔ شکلا کی جب بھڑاس نکل گئی تو وہ ..... بولی..... ''تپائی پر..... دودھ..... رکھا ہے..... پی..... لو.....'' ایک لمحہ کو شکلا کو جھٹکا لگا۔ دودھ تو روز کا ہی معمول تھا مگر..... ایسے..... حالات..... میں..... بھی..... اسے دودھ کی فکر ہونا۔ وہ بیوی کے صبر پر ایک بار پھر حیرت میں پڑ گیا۔ وہ منی کی نفسیات سے بہتر طور پر واقف تھا اور چوں کہ اس کے ساتھ یہ پہلی بار نہیں ہوا تھا۔ ادھر ادھر سے شکلا کی کرتوتوں کی خبر اُسے پہلے بھی ملتی رہی تھیں۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی بیوی بے بال و پر کی ایسی چڑیا ہے جو ہمیشہ کے لیے اپنی پرواز کھو چکی ہے۔ یہ سب تو شروع سے ہی دیکھتی آئی تھی اور آگے کون جانے، کب تک چلے گا؟ اپنے خیالوں میں الجھی منی بہت دیر تک جاگتی رہی۔ بدبودار خرّاٹے ..... نہ ..... بھی ہوتے تو اتنی آسانی سے اسے نیند کہاں آجاتی.....؟ صبح کے ساتھ ایک نئے دن کا آغاز ہوا۔ سب کچھ نارمل تھا۔ شکلا جانے سے پہلے منی سے دو خیر کے بول بولنا چاہتا تھا اور شاید منی کو ایسا کچھ احساس ہو گیا تھا اس لیے وہ گڈو کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔

ہفتہ..... عشرہ..... اور گزر گیا..... شکلا کو یقین ہو گیا کہ منی کے ذہن سے سب کچھ محو ہو گیا ہے۔ حسب معمول اس نے منی کو ایک رات پھر اپنی طرف کروٹ دلائی۔ اس بار اس کا رویہ قطعی جارحانہ نہیں تھا بلکہ کافی پیار و محبت جتانے کی بھی کوشش کی گئی۔ یہ دیکھ کر کہ منی نے بھی خاطر خواہ مثبت جواب دیا۔ شکلا کو حتمی یقین ہو گیا کہ اس کا ذہن بالکل صاف ہو گیا ہے۔ شکلا کو یہ دیکھ کر اچھا لگا کہ اس بار اُسے ساڑی اٹھانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ منی کی خاطر مدارات پر وہ اندر ہی اندر خوش ہوتا رہا۔ وہ کافی دیر تک اسے پیار کرتا رہا۔ سمندر میں مدوجزر کی خبر تو آئی مگر پانی کا سکوت اس کی نفی کرتا رہا۔ تمام کوششوں اور جدوجہد کے باوجود جسم اور جذبے یخ بستہ ہی بنے رہے۔ کہیں دور تک کسی موج کا شائبہ بھی نہیں اُبھرا۔ ہار کر وہ اپنی جگہ آ کر لیٹ گیا۔ چہرہ پسینے میں بھیگا ہوا تھا۔ ندامت اور شرمندگی کے تاثرات یک کے بعد دیگرے آ جا رہے تھے۔ پھر اس نے..... خاموشی سے دوسری جانب کروٹ کر لی..... ''کا..... ہوا.....؟''

منی کا یہ سوال شکلا کی سماعت پر کسی ایٹمی بم کی طرح گرا تھا۔ منی کو معلوم تھا کہ کچھ سوالوں کے جواب نہیں ہوتے۔ ہوتے بھی تو آدمی اتنا بے بس و لاچار ہو جاتا ہے کہ چاہ کر بھی نہیں دے پاتا۔ شکلا کو لگ رہا تھا جیسے کسی لونڈے نے کنّے سے اس کی پتنگ کاٹ دی ہو اور وہ ہاتھ میں جھولتی ہوئی ڈور تھامے ..... گرتی..... ڈولتی ..... پتنگ کو دیکھ رہا ہے۔ پتنگ بازی میں اُستاد ہونا اور بات ہے..... مانجھے کی دھار، کچھ اختیار اپنے پاس بھی تو رکھتی ہے۔ اتنی سامنے کی بات کبھی ذہن میں نہیں آئی۔ اس کے سامنے جیتنے والی کوئی اور نہیں ایک پتلی اور کمزور ڈور تھی اور یہ خیال ہی تو شکست کے نقش و نگار گہرے کر دیا تھا ایسا ..... کیوں..... کر..... ہوا.....؟ وہ سمجھنے سے قاصر تھا..... کیا..... وہ ..... اب..... بوڑھا ..... ہو گیا ہے..... ہرگز نہیں ..... اپنے سوال کی خود ہی

www.urduchannel.in

شدت سے نفی کی۔ ابھی کچھ دنوں پہلے تک تو سب کچھ ٹھیک تھا پھر یہ اچانک...... ایسا..... کیسے...... ہو...... سکتا...... ہے......؟ بہت سارے سوالات دائیں بائیں سے نکل کر آرہے تھے مگر آج اس کے پاس کوئی مثبت جواب نہیں تھا۔اس کے برخلاف منی کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ تھی۔شاید چوبیس برس پہلے والی . . . . . . آج بھی اسی کمرے...... کے در و بام تھے اور وہاں صرف وہی دونوں تھے...... اس واقعہ کے بھی گواہ ۔آج بہت دنوں بعد اسے بہت جلدی نیند آ گئی۔ جاگنے کی باری تو اب شکلا کی تھی، وہ کب تک کروٹیں بدلتا رہا یہ کسی کو نہیں معلوم......۔

منی صبح سو کر اٹھی تو کچھ زیادہ ہی تازہ دم نظر آ رہی تھی۔ چہرے پر ایک عجیب سی سرشار جیسی کسی فاتح کے چہرے پر ہوتی ہے۔ شکلا کام کا بہانا کر کے معمول کے برخلاف کچھ جلدی ہی نکل گیا۔ منی کو شاید اس بات کا اندازہ پہلے ہی تھا۔ وہ گڈو کا ناشتہ لے کر اس کے کمرے میں داخل ہوئی۔ گڈو ٹی وی پر فٹ بال میچ دیکھ رہا تھا۔ وہ اسی کے پاس بیٹھ گئی۔ ''تو ہسے اتنی بار کہا کہ تنک ہم کا بھی ...... اسی ...... کھیل کے بارے میں سمجھائی دیو......'' ماں!...... یہ فائنل میچ ہو رہا ہے...... فائنل سمجھتی ہو...... نہ......؟ گڈو کی بات پر وہ پھر گویا ہوئی...... ہاں...... کا ہے...... نہیں سمجھت ہیں...... وہ اور زیادہ انہماک سے دیکھنے لگی کہ شاید فائنل اسی طرح دیکھا جاتا ہے۔ اچھا لیو...... پراٹھا ...... کھاؤ...... نہیں...... تو ٹھنڈا...... ہو جائے گا...... ماں...... ادھر بھی انٹرول ہو گیا...... مطلب...... آدھا...... کھیل...... اب دس منٹ بعد شروع ہوگا۔ یہ کہہ کر وہ پراٹھا کھانے لگا۔ ماں اس کے پاس بیٹھی اسے نہارتی رہی۔ کچھ کھیل کی اور کچھ ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی...... ماں...... چائے...... اور...... ہے......؟ گڈو نے پوچھا تو وہ گلاس لے کر کھڑی ہو گئی...... ہاں...... ہے...... ابھی...... لاوت...... ہیں......

اور پھر چند لمحوں کے بعد وہ پھر سے کمرے میں داخل ہوئی۔ گڈو چائے کے بغیر پراٹھا نہیں کھاتا اس لیے اس کا ہاتھ رُک گیا تھا۔ اب تک میچ بھی پھر سے شروع ہونے والا تھا...... ماں اس کے پاس بیٹھ گئی۔ گڈو ماں کو کچھ کھلاڑیوں کی اہمیت اور افادیت کے بارے میں بھی بتانے لگا تبھی ماں بول پڑی...... گڈو...... اہی...... کا...... ابھی تو...... یہ...... لال...... جرسی...... والے اُو طرف بھاگ رہے تھے...... اب...... گیند لے کر...... اپی...... طرف...... اپی...... کیسا...... کھیل...... ہے......؟ ماں ...... آدھے سمے بعد گول پوسٹ بدل جاتا ہے...... یہ کھیل کا نیم ہے۔ ادھر والی ٹیم...... ادھر ہو جاتی ہے...... اور اُدھر والی...... ادھر...... ماں بہت حیرت اور معنی خیز اندر میں مسکرائی اور گڈو کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیر کر گلاس، تھالی سمیٹ کر کمرے سے باہر نکل گئی......۔

❁❁❁

www.urduchannel.in

شناخت

حسب معمول دکان سے واپسی کے بعد شام کی چائے کے ساتھ میں بیوی سے محو گفتگو تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ بیگم کو آج کس موضوع پر بات کرنی ہے بلکہ سوالوں کی جھڑی لگا دے گی اور وہی ہوا۔ اس نے ایک ساعت کا بھی انتظار کیے بغیر پہلا سوال داغا۔ ''اور کیسا رہا آج کا دن؟ کس کس نے وِش کیا، میسج کس نے بھیجے؟ دراصل آج ہماری شادی کی سالگرہ تھی۔ شاید اسی وجہ سے میں مسلسل اس کوشش میں تھا کہ چہرے کے تاثرات نہ بگڑیں اور نہ ہی زبان سے کچھ اوٹ پٹانگ نکلے جس سے خواہ مخواہ ماحول خراب ہو۔ ان چونچلوں سے مجھے کسی حد تک وحشت ہوتی تھی۔ میں تو اپنی یوم پیدائش منانے کو معیوب سمجھتا پھر یہ شادی کی سالگرہ جسے .Marriage Anniversary کہتے ہیں، اس موضوع پر کچھ کہنے سے دل کے چھالے نہیں پھوٹتے۔ اس کی لذت و کرب کا درست اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب منھ اور آنکھیں بند ہوں۔ ایسے میں کہیں گوشۂ عافیت مل جائے جہاں کوئی رخنہ نہ ڈالے تو اُس سے بہتر جشن بھلا اور کس طرح ممکن ہے؟

میں اپنے عزیز و اقارب اور دوستوں کے بارے میں غور و فکر کرتا ہوں۔ آج کے دور میں مخلص اور صدق دل سے محبت کرنے والے نصیب ہی کتنوں کو ہوتے ہیں۔ میں اس معاملے میں بھی خود کو خوش نصیب مانتا ہوں۔ اب تو جذبوں کی ترسیل کے لیے اکثر لوگوں کے موبائل میں میسج کا رڈ پڑا ہوتا ہے جو Bulk میں اپنے مقام تک پہنچتا ہے۔ میں نے بیگم کو وہ تمام تفصیلات بتائیں جنھیں سننے کے لیے وہ صبح سے بے چین تھیں۔ Inbox کھول کر تمام ایس ایم ایس پر اظہار خیال کیا۔ میں خاموشی سے اس کی باتیں سنتا رہا بلکہ اداکاری کرتا رہا۔ تہنیت کے SMS پر اظہار خیال کیا۔ میں ان باتوں سے بور ہو رہا تھا۔ البتہ اس سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ اب گزرے وقت کو پھر سے یاد کیا جائے۔ میری عمر تقریباً پچاس برس کی ہو رہی تھی..... پچاس..... برس.... نصف صدی..... ایسے سوچو تو یہ وقت بہت زیادہ لگتا ہے لیکن جب ماضی کی بازیافت ہوتی ہے، آب و گل میں لپٹی کٹھی میٹھی یادیں وقت کی فصیل سے سر اوپر نکالتی ہیں تو یہ پچاس برسوں کا سفر چند سالوں میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اتنی طویل مسافت اچانک حیرت انگیز طور پر مختصر ہو جاتی حافظہ بہتوں سے خراب تھا مگر بہتوں سے بہتر بھی تھا۔ یادوں کی چاند ماری بھی کیا چیز ہے۔ ایک بار شروع ہو جائے.... تو..... وقفے سے ایک کے بعد ایک فائر ہوتا ہی رہتا ہے۔ وقت کے ترازو پر اطمینان اور بے اطمینانی دونوں پلوں میں رکھ کر یہ دیکھنا کہ وزن کس طرف زیادہ ہے۔ ہے.... بھی.... یا... کانٹا بیچ میں ہی معلق ہے؟ زندگی سے مطمئن ہونے کا مطلب صرف یہ نہیں کہ آسودگی کے جو خواب دیکھے تھے، وہ پورے ہوئے یا نہیں۔ ایک معنی تو یہ بھی ہے کہ مستحقین کے حق ادا کیے یا نہیں... تو.... پھر کس بات سے ڈر لگتا ہے؟ یہ سوال کبھی کبھی مجھ سے میرا ہمزاد بھی پوچھتا ہے۔

''تو قیر.... بھائی... کا... فون.... نہیں... آیا..... کیا...؟'' عارفہ کے ٹوکنے پر میں اس کی طرف متوجہ ہوا۔ ''ہاں.... آیا تھا، بلکہ وہ خود بھی آ رہا ہوگا۔'' میں نے آہستہ سے جواب دیا

www.urduchannel.in

۔تو قیر کا نام جیسے key Board پر Inter کا بٹن تھا جس پر انگلی پڑتے ہی بے شمار سائے سے لہرانے لگے۔ایک بار پھر سے چاند ماری شروع ہوگئی۔

تو قیر میرا سب سے اچھا دوست تھا اور سب سے پرانا بھی بلکہ دوست سے زیادہ بھی اگر کچھ ہوتا ہے تو وہ میرے لیے وہ تھا۔ ہم ایک ہی محلے میں رہتے تھے۔اس نے میرے اسکول میں داخلہ لیا تھا یا میں اس کے اسکول میں منتقل ہوا یہ ٹھیک سے یاد نہیں۔لیکن ایک بار جو دوستی ہوگئی تو پھر ماہ وسال کے ساتھ اور گہری ہوتی گئی۔

دوست کے نام پر یوں تو زندگی میں خاصے لوگ آتے ہیں۔اکثر وقت کی تیز وتند آندھیوں میں معدوم ہوجاتے ہیں۔اس کی وجہ شاید اُن سے وہ ذہنی ہم آہنگی نہیں ہو پاتی جس کا تقاضا دونوں ہی ایک دوسرے سے کرتے ہیں۔تو قیر اس لحاظ سے بھی میری توقعات پر کھرا اترا تھا شاید اس سے بھی زیادہ۔اس میں ایک ساتھ کئی لوگوں کی خوبیاں موجود تھیں۔ کم سے کم میرا خیال تو یہی تھا۔ہر کسی کا غمگسار، ہر کسی کے کام آنے والا۔اتنے دنوں کے مراسم کے بعد بھی میں نے اسے کبھی کسی کو غلط مشورہ دیتے ہوئے نہ دیکھا اور نہ سنا۔برے وقت میں ہر کس وناکس کے کام آنے والا۔میں اس کی مثبت سوچ اور اخلاقی رویوں کے سبب اس کی بہت قدر کرتا بلکہ احترام کرتا تھا۔

وہ بہت وضع قطع والا انسان بھی تھا۔اللہ نے اسے اچھی خاصی شکل وصورت بخشی تھی جسے اس نے اپنے طور طریقوں وعادات واطوار سے اور بھی دیدہ زیب بنادیا تھا۔ ملبوسات کا اسے بہت شوق تھا اور سلیقہ بھی اتنا ہی تھا۔رنگوں کے امتیاز کی بھی بڑی معلومات تھی۔شکن کپڑوں پر ہی نہیں جبیں پر بھی آسانی سے دیکھنے کو نہیں ملتی۔اس معاملے میں بھی میں نے تو قیر سے کافی کچھ سیکھا تھا۔ ہمارے ذوق وشوق بھی کسی حد تک مشترک تھے۔ مثلاً کرکٹ کے ہم دونوں ہی دیوانے تھے۔طالب علمی کے زمانے میں ساتھ کھیلتے بھی تھے۔

شکار کا بھی ہمیں بہت شوق تھا۔شعر وادب بھی ہم دونوں کا یکساں پسندیدہ موضوع تھا۔ بہت سے محاورے، کہاوتیں پہلی بار میں نے تو قیر کی ہی زبان سے سنی تھیں۔حالاں کہ میری دادی بھی یہ سب خوب سنایا کرتیں مگر تو قیر کے منھ سے سن کر جیسے بات ذہن سے چپک جاتی تھی۔ایسا کیوں تھا۔یہ عقدہ میں کبھی سمجھ نہیں پایا۔

مجھے خوب اچھی طرح یاد ہے کہ ہم لوگ اپنے انگریزی کے استاد کا بہت مذاق اڑاتے تھے۔ہمارے مذاق کا ہدف سب سے زیادہ ان کے جوتے بنتے۔کپڑے لتے تو وہ ٹھیک ٹھاک پہنتے مگر جوتوں سے کوئی ربط پیدا نہیں ہوتا، کئی بار سلائی کرانے کے بعد دو تین چرمی پیوند بھی لگے ہوتے۔پالش کے بعد بھی وہ بڑے عجیب بلکہ مضحکہ خیز لگتے۔انہی دنوں تو قیر نے کہا تھا کہ جوتے آدمی کی شخصیت کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔اس وقت نہ یہ معلوم تھا کہ شخصیت کس چڑیا کا نام ہے اور آئینہ دار سے کیا مراد ہے۔وقت کے ساتھ جب عمر اور تجربے میں کچھ اضافہ ہوا تو لفظ 'شخصیت' کی قرأت اور معنویت سے واقف ہوا۔یہ واہمہ تو بہت بعد میں ٹوٹا کہ بنی نوع آدم کی معنویت تفہیم اتنی آسان نہیں جتنی کہ ہم نے گردان لی تھی ۔یہ معاملہ تو وقت کے ساتھ مزید پیچیدہ ہوتا گیا۔

جہاں تک جوتے چپل سے کسی آدمی کو سمجھنے کی بات ہے تو کسی حد تک یہ درست بھی ہے مگر یہ سب کچھ مجھے کسی کھیل کی طرح دلچسپ لگتا۔ایسا نہیں ہے کہ صرف جوتے سے کسی کی جبلت کو سمجھا جاسکتا ہے مگر کسی حد تک اس کے مزاج کا اجمالی تعارف ہو ہی جاتا ہے۔ میں نے ایسے کم لوگ ہی دیکھے ہیں جن کے ملبوسات سے جوتے یا چپل میل کھاتے ہیں۔یہ فرق یا مطابقت آدمی کے رویوں کی تھوڑی بہت ترجمانی تو کرتی ہی ہے۔جو لوگ جوتے میں روز پالش کرتے ہیں یا روز نہیں کرتے ہیں، یہ صرف عادت کے فرق کو ہی نمایاں نہیں کرتا، مزاج کے فرق کی نشاندہی بھی کرتا ہے۔یہ باتیں بھی میرے ذہن سے چپک کے رہ گئیں

www.urduchannel.in

تھیں۔ میری نگاہ اب غیرارادی طور پر پیروں سے ہوتی ہوئی اوپر کا سفر کرتی ہے۔نظر براہ راست اگر چہرے پر پڑ بھی جائے تو پیروں کی ٹوہ لینا ہرگز نہیں بھولتی۔ یہ سب کچھ لاشعوری طور پر وقوع پذیر ہوتا ہے۔بعض اوقات مجھے اپنی یہ عادت بڑی عجیب بھی لگتی لیکن نظر نیچے کی طرف جانے سے باز نہیں آتی۔

ذہن بھی لمحوں میں کہاں سے کہاں تک کا سفر کرادیتا ہے۔ عارفہ کچھ کہنے ہی والی تھی کہ توقیر مع اپنی بیگم کے کمرے میں داخل ہوا۔''تم لوگ ابھی تک تیار نہیں ہوئے''۔ سلام دعا کے بعد اس نے برجستہ سوال کیا۔ عارفہ کے ساتھ میں بھی حیرت میں تھا۔''خیرت ....تو....ہے....ہمیں.....کہاں جانا...ہے....؟''سوال میں میں نے حیرت کا اظہار بھی کیا۔''تم نے ابھی تک بھابھی کو کچھ نہیں بتایا۔چلو میں ہی بتائے دیتا ہوں۔ بھابھی ہم لوگ Anniversary کہیں باہر Celebrate کرنے جارہے ہیں اور یہ سارا پروگرام آپ کے میاں نے ہی بنایا ہے۔دراصل یہ سب کو Surprise دینا چاہتا تھا لیکن آپ کو تو پتا ہے کہ میں پیٹ کا کتنا ہلکا ہوں۔اس کی بات پر ایک دم سے سب لوگ ہنس پڑے۔ میرے چہرے پر بھی مسکراہٹ تیر گئی۔ عارفہ مجھے پیار بھری نظروں سے دیکھنے لگی۔اسے توقیر کی کاری گری پر ذرا بھی شک نہیں ہوا۔حقیقت تو صرف مجھے اور توقیر معلوم تھی۔اس نے چائے، پانی کے لیے بھی منع کر دیا۔تاویل یہ پیش کی کہ آج کھانے پینے کا سارا اہتمام باہر ہی ہوگا۔بس آپ لوگ جلدی سے تیار ہو جائیں۔ مجھے ابھی اپنے بچوں کو بھی Pick کرنا ہے۔''اس نے رموٹ اٹھا کر ٹی وی آن کیا اور ہم لوگوں نے اپنے آپ کو۔

دیر رات جب ہم لوگ واپس آئے تو سب بہت خوش تھے۔ظاہر ہے یہ سب توقیر کا کیا دھرا تھا۔اس نے مجھے بھنک تک نہیں لگنے دی۔کھانے کا Bill بھی اسی نے ادا کیا۔ میں اس سے ہمیشہ ہی ہار جاتا ہوں لیکن جذبوں میں خلوص اتنا ہوتا ہے کہ حسد یا جلن کا شائبہ

بھی نہیں ابھرتا۔ وہ عین وقت پر کوئی ایسی بات کہہ دیتا کہ ہاتھ کے ساتھ حوصلہ بھی پیچھے سرک جاتا ہے۔

توقیر کا گھر میرے گھر سے کچھ فرلانگ پر واقع تھا۔ ہم دوسرے تیسرے دن ملاقات کرتے۔کبھی وہ میرے گھر آجاتا تو کبھی میں اس کے یہاں چلا جاتا۔ اکثر گھر کے بقیہ لوگ بھی شامل ہوتے۔ ہم دونوں آپس میں رشتے دار نہیں تھے مگر ایک دوسرے کے گھر کے اہم ترین افراد تھے۔کوئی چھوٹا بڑا فیصلہ ایک دوسرے سے رائے مشورے کے بغیر نہیں کرتے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے خاصے راز جانتے تھے۔ ہمارے معاشقے بھی ڈھکے چھپے نہیں تھے۔ ہمارے درمیان کوئی ایسی بات نہیں تھی جسے ہم ایک دوسرے سے پوشیدہ رکھنے کے بارے میں سوچتے۔مختلف موضوعات پر ہماری گفتگو ہوتی۔ مباحث بھی ہوتے مگر تان آخر اسی موضوع پر آکر ٹوٹتی جو ہم دونوں کا ہی سب سے پسندیدہ موضوع تھا۔سب سے زیادہ دیکھا بھالا اور بھوگا ہوا۔وقت کے ساتھ بدلی ہوئی اقدار بلکہ اقدار کا نوحہ۔

میں اور توقیر اچھے وقت کے گواہ ہیں جب لوگ ایک دوسرے سے بے غرض اور بے لوث محبت کیا کرتے تھے۔ آرائش اور تصنع کے غازے سے عاری سب ایک دوسرے کے سکھ دکھ میں برابر کے شریک۔اس وقت لوگ کپڑے، زیور...وغیرہ نہیں دیکھتے تھے۔ رشتوں کی قدر و قیمت کا تعین ایثار وقربانی پر مبنی تھا۔اکثر لوگوں کے کپڑے صرف عید میں ہی بنتے تھے۔روپے پیسے کی تنگی کے باوجود عیدیں تو وہی ہوتی تھیں۔لوگوں کے پاس ملنے جلنے کے لیے وقت تھا۔لوگ دوسروں کے عیوب کی پردہ پوشی اتنی سادگی سے کرتے کہ گناہ کرنے والا بھی مشکوک ہو جاتا کہ یہ جرم یا گناہ اس نے کیا بھی ہے یا نہیں۔

وہی یادیں تو اب شب خون بنی ہوئی تھیں۔حالاں کہ ہماری عمروں کے اور بھی تو بہت لوگ ہیں مگر یہ ان کا مسئلہ کیوں نہیں؟ اکثر لوگوں نے خود کو اس نئے رنگ میں شامل کرلیا

ہے۔ وہ اس طرح اس نئے منظر نامے میں رچ بس گئے ہیں کہ شفیق اور محبتوں سے بھرے انسانی پیکر تو کیا ان کے ہیولے بھی انھیں نظر نہیں آتے۔ بار ہا ہمزاد سے جھگڑتا ہوں.....تو پھر ہماری ہی زندگی اجیرن کیوں بنی ہے۔ اپنے آپ سے فرار اگر اتنا ہی آسان ہوتا....تو.. ....؟'' کیا.....نیند....نہیں......آرہی....؟ عارفہ نے سرگوشی کی۔ ''ہوں'' میں نے بھی آہستہ سے جواب دیا۔ ''ٹی وی چلا لیجیے۔'' وہ پھر سے گویا ہوئی.... ''وہی.....تو.....آن کر ......لیا ہے۔'' جملہ زبان پر آتے آتے رہ گیا...... ''ابھی.....آہی....جائے گی۔'' کہہ کر کچھ لمحوں تک میں نے کسی اور جملے کا انتظار کیا مگر ادھر سے کوئی آواز نہیں آئی اور میں ایک بار پھر لق و دق صحرائے کے سفر پر۔

اس زمانے میں ہم لوگوں کو شکار کا بہت شوق تھا۔ کئی اور دوست بھی ہوا کرتے تھے۔ چوں کہ وقت کی گرانی نہیں تھی اس لیے جب موڈ بن گیا، نکل پڑے۔ یہ بالکل آخر میں طے ہوتا کہ مچھلی کے شکار پر جانا ہے یا بندوق کے۔ جگہ کا انتخاب بھی تبھی ہوتا۔ پروگرام طے ہوتے ہی سب تیاریوں میں لگ جاتے۔ ذمے داریاں بانٹ دی جاتیں۔ چرئی کے لیے دو لوگوں کو لگایا جاتا۔ ایک کھلی اور چنے کی دال کوٹے گا، دوسرا بھنائی کے بعد شیرے میں لپیٹ کر ٹکیہ بنائے گا۔ کچھ ٹکیے آٹے کی بھی بن جاتیں۔ فشنگ راڈ، گراری، کانٹوں کی جانچ پڑتال ہوتی اور پھر سارا سارا دن ایک مچھلی کے انتظار میں بیٹھے رہتے۔ محبوب کے انتظار سے کم لطف نہیں آتا تھا۔ جنھیں شکاریات میں دلچسپی نہیں تھی وہ فقرے بازیاں کرتے، ''دن بھر کے بعد کمائسُد لوگ آئے ہیں وہ بھی خالی ہاتھ۔'' اب انھیں بتایا بھی کیا جائے۔ ان کی منطق تو یہ ہے کہ بازار میں فلاں مچھلی فلاں بھاؤ میں بک رہی ہے۔ جایئے اور جتنی ضرورت ہو شکار سے کم خرچ پر خرید لائیں۔ دن بھر ایک دوسرے کو خاموش کرانے کے تکلف اور صعوبتوں سے بھی نجات۔ اب کسے سمجھائیں کہ تم جسے صعوبت سمجھتے ہو یہ سارا کاٹنا تو اسی

کے لیے ہے۔ صرف مچھلی کھانا ہی مقصود ہوتا تو کم سے کم تم سے تو رائے مشوروں کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اور کیا ہم نے مچھلیاں کھائیں نہیں۔ جانے کون کون سی اور کہاں کہاں کی ....ایک سے اک قیمتی....مگر ان سے ہماری کون سی یادیں وابستہ ہیں۔ کچھ رد و قبول کے ساتھ شکار کا شوق تو ہمارے بچوں کو بھی ہے۔ پر وہ کمپیوٹر Computer اور ٹیبلٹ Tablet پر Hunt کے نام سے کھیلتے ہیں۔

میں اور توقیر ہم جماعت تھے مگر وہ مجھ سے بہت ذہین تھا اور مجھ سے ہی کیا وہ اکثر طالب علموں سے آگے تھا۔ زندگی کے تئیں اس کا تجربہ حیرت انگیز تھا۔ خاصی چیزوں کے بارے میں پہلی بار توقیر نے مجھے بتایا بلکہ میرا خیال تھا کہ میری ذہنی تربیت کسی حد تک توقیر کی ہی مرہونِ منت ہے۔

ہم جب کالج پہنچے تو ادبی ذوق بھی پیدا ہو چکا تھا اور ہم نے مضمون کے طور پر ادب کا انتخاب کیا۔ شعری ذوق کچھ زیادہ تھا۔ مصرعے بھی موزوں کرنے لگے تھے مگر ایک دوسرے کے علاوہ کسی اور کو نہیں سناتے۔ افسانے پر بھی خامہ فرسائی کی لیکن جلد ہی یہ معلوم ہو گیا کہ تخلیق کی بیل ہم دونوں کی منڈیر نہیں چڑھے گی۔ اس بات کی آگاہی پر ہم آج تک اوپر والے کا شکریہ ادا کرتے ہیں، لطف اندوز بھی ہوتے ہیں کہ مبادا بہتوں کی طرح یہ معلوم ہی نہیں ہو پاتا کہ خراب یا بہت خراب لکھتے ہیں۔ مطالعہ کا شوق آج بھی بدرجۂ اتم موجود ہے ہر چند کہ گھر دوکان کے جھمیلوں میں وقت کی تنگی رہتی ہے۔ چوں کہ وقت کی برکت بھی ختم ہو گئی مگر کچھ ذاتی فائدوں کے سبب اسے ترک نہیں کر سکتے۔ کہنے والے تو اسے کارزیاں بھی کہتے ہیں۔ ممکن ہے وہ صحیح کہتے ہوں مگر میرے چراغوں کو تو روشنی یہیں سے دستیاب ہوتی ہے۔ سوچوں میں وسعت تو پیدا ہوتی ہی ہے ساتھ میں جو خود اعتمادی آتی ہے اس کا نعم البدل شاید اور کہیں ممکن نہیں۔

www.urduchannel.in

صبح ہونے میں ابھی دیر تھی۔ ایک ضرورت کی وجہ سے اٹھنا پڑا۔ صغیر چچا یاد آ گئے تھے۔ وہ ہمارے بچپن کے ایک بزرگ شاعر تھے۔ بڑے نستعلیق قسم کے۔ مجھے یاد نہیں کہ کبھی شیروانی کے بغیر بھی انھیں دیکھا ہو۔ بڑے مہذب اور شائستہ گفتگو کرنے والے۔ شاعری تو وہ بہت روایتی انداز کی کرتے تھے مگر ہم لوگ ان کی شرافت کے اس درجہ قائل تھے کہ کہیں نہ کہیں شاعری بھی قبول کر لی تھی۔ دراصل جس واقعہ کی وجہ سے صغیر صاحب اس وقت یاد آئے تھے وہ کچھ اور ہی تھی۔ ایک بار اپنے دوست کی زمین میں ایک غزل کہہ لی۔ اس کے بعد یاد آیا کہ اجازت تو لی نہیں۔ اس بات سے اس درجہ فکر مند ہوئے کہ رات بھر سو بھی نہ سکے اور فجر کی اذان ہوتے ہی ان کے در پہ صدا دی۔ انھوں نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا ....اتنی....صبح...اللہ....خیر....ٹھہریئے....حاضر ہوتا ہوں۔ کہہ کر ننگے پاؤں تیزی سے زینہ اتر کر آئے۔ روداد معلوم ہوئی تو وہ صغیر صاحب سے زیادہ شرمندہ تھے۔ اس واقعہ کے ساتھ اور بھی جانے کیا کیا یاد آیا۔ نیند اچٹ گئی تھی حتیٰ کہ اذان ہوگئی۔

آنکھوں میں جلن سی ہونے لگی۔ منھ دھونے کے بعد بھی نیند پوری نہ ہونے کی وجہ سے جلن ہو رہی تھی۔ جوتے کسی کی شخصیت کو سمجھنے کے لیے کتنے معاون ثابت ہوتے ہیں یہ عقدہ اس وقت نہیں معلوم تھا۔ اب صغیر چچا کے جوتے یاد کرتا ہوں تو اس کہاوت پر یقین اور مستحکم ہو جاتا ہے۔

توقیر کا شمار آج شہر کے بڑے Saddlery Exporters میں ہوتا تھا۔ حالاں کہ یہ کام اس کے والد نے شروع کیا تھا۔ توقیر اپنے آٹھ بھائی بہنوں میں سب سے چھوٹا تھا۔ باقی چاروں بھائی مختلف اور خاصہ بہتر کاروبار کر رہے تھے۔ سب خوش حال بھی تھے اور خوش باش بھی۔

ابا نے توقیر کو تعلیمی فراغت سے پہلے ہی دفتر طلب کر لیا۔ تعلیم ختم ہونے کے بعد وہ

باقاعدہ اور مستقل طور پر وہاں لگ گیا۔ کاروبار جمانے کی جدوجہد تو کرنی نہیں تھی بس نظام کو سمجھنا تھا۔ ابا کو پچھلے دنوں دل کا دورہ پڑ چکا تھا۔ انھوں نے فوراً By pass بھی کرا لی لیکن اس کے باوجود خدشے تو بڑھ ہی گئے تھے۔ شاید اس وجہ سے انھوں نے فوراً جس کا جو حق تھا ادا کر دیا۔ بدلے حالات میں زمین جائیداد کے جھگڑے رشتوں کا تقدس ہی پامال نہیں کرتے، رشتے ہی ختم کر دیتے ہیں۔ توقیر کے حصے میں وہ Firm آئی جہاں وہ ابا کے ساتھ بیٹھنے لگا تھا۔ ابا کے فیصلے پر سب نے ایک ساتھ تائید کی تو ابا نے راحت کی سانس لی اور شائد توقیر نے بھی۔

وہ تعلیم یافتہ تھا۔ اس نے Business Administration میں سند لی تھی۔ ابا کے انتقال کے بعد جب وہ خود مختار ہوا تو کام کاج کے طور طریقوں میں ہی تبدیلیاں نہیں ہوئیں۔ منافع میں بھی حیرت انگیز اضافہ ہوا۔ ظاہر ہے یہ سب کچھ توقیر کی اپنی صلاحیتوں اور قسمت کا ثمرہ تھا۔ ایک ایسی زندگی جس کا خواب گدگدی پیدا کرتا ہے اور اکثر لوگ دیکھنا چاہتے ہیں، توقیر کو حاصل تھی۔

کتب بازار میں دادا کے زمانے کی ہماری بھی ایک دکان تھی جو ورثے میں ابو کو ملی تھی اور پھر میری دسترس میں آ گئی۔ یہ سب پہلے اتنا ہی آسان ہوا کرتا تھا۔ اس وقت دکان میں صرف مذہبی کتابیں ہی فروخت ہوتی تھی، پرانی کتب لوگ دکانوں پر نہیں بیچتے تھے۔ ضرورت مند کو ہدیہ کر دیتے تھے۔ جب میں نے دکان سنبھالی تو جدید علوم سے متعلق کتابیں بھی رکھ لیں۔ نصابی کتب تو ابو کے ہی زمانے سے شروع ہوگئی تھیں۔ میں نے کچھ ادبی رسائل و جرائد بھی منگوائے مگر اس کے خریدار نہ ہونے کے سبب کچھ خسارے کے ساتھ وہ سلسلہ بند کر دیا۔ الحمد اللہ دکان ٹھیک چل رہی تھی۔ پیسے کی ریل پیل نہیں تھی مگر آسودگی تھی۔ ضروریات تو پوری ہو رہی تھیں خاصے پیسے بچ بھی جاتے۔

www.urduchannel.in

اب میرے بچے بھی بڑے ہو گئے تھے۔ دکان میں بیٹوں کی مدد ملنے لگی تھی۔ شام کو ان کا فارغ وقت دکان پر گزرنے لگا جس سے مجھے بہت راحت ملی مگر میری آرام سے زیادہ ضروری ان کی غلط صحبت سے دفاع ہو۔ یہی عمر ہوتی ہے جب بچوں پر خاص توجہ کی ضرورت پڑتی ہے۔ ابھی تک تو صورت حال بظاہر تو اطمینان بخش ہی لگ رہی تھی لیکن دھڑکا سا لگا رہتا۔ اس بات کی خوشی بھی تھی کہ بچے خاطر خواہ دلچسپی لے رہے تھے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اَب انھیں جیب خرچ کے لیے پیسے کچھ زیادہ ملنے لگے تھے۔

کتب بازار کے مشرقی حصے میں سڑک کے اس پار چوراہے، اس کے ایک کونے میں شہر کا سب سے بڑا Shopping Mall ہے۔ یہ مال میرے گھر اور دکان کے وسط میں استادہ ہے۔ کل اتوار کی شام تھی۔ میں اور توقیر اپنے بچوں کے ساتھ وہاں گئے تھے۔ عادت کے مطابق توقیر نے ایک بار پھر بل (Bill) کی ادائیگی میں عجلت دکھائی۔ ''معلوم ہے اللہ نے تمھیں بہت پیسے دیے ہیں مگر کبھی مجھ غریب کو بھی یہ موقع ملنا چاہیے۔'' غیر ارادی طور پر میری زبان سے یہ جملہ نکلا اور وہ ایکدم سے ٹھہر گیا۔ اس نے میری بات کو بہت سنجیدگی سے لیا تھا۔ جواب میں ایک تقریر بھی سننے کو ملی۔ ہمارے درمیان یہ پیسہ کب سے آ گیا.....؟ حالاں کہ ہم اس موضوع پر پہلے بھی بات کر چکے تھے۔ اس وقت تو مذاق زیادہ تھا جو وہ کچھ دیر سے سمجھا۔ کبھی کبھی بہت ذہین آدمی کے ساتھ بھی ایسا ہو جاتا ہے۔ بس مجھے بل کی ادائیگی کرنی تھی جس کے لیے میں نے یہ حربہ استعمال کیا۔ توقیر اور میرے درمیان ایک ذہنی ہم آہنگی تھی جو اتنے دیرینہ مراسم کے استحکام کی اصل وجہ تھی۔ ہماری ترجیحات مال و زر کبھی نہیں رہیں۔

''آج تو پیمنٹ تمھیں ہی کرنا ہے۔'' عارضی برہمی کے ساتھ وہ خاموش ہوا۔ میں زور سے ہنس دیا۔ بقیہ لوگوں نے بھی میرا ساتھ دیا۔ آخر میں اسے بھی ہنسی میں شامل

ہونا پڑا۔ اس خوشی میں کولڈ ڈرنک کا ایک دور پھر چلا۔ معاً توقیر نے اشارہ کر کے مجھے دائیں جانب کچھ دکھانا چاہا۔ مجھے لگا کہ کوئی غیر معمولی حسین لڑکی ہو گی کیوں کہ خوب صورت چہرے اور بدن ہم دونوں اپنی اوائل عمری کے زمانے سے بڑے شوق اور تجسس سے دیکھتے رہے تھے اور باقاعدہ گفتگو بھی کرتے تھے۔ پر آج وہاں ایسا کچھ نہیں تھا۔ میاں بیوی اور غالباً انھیں کے دو بچے بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ ہمارے شناسا بھی نہیں تھے۔ میں صورت حال سے ابھی واقف نہیں ہوا تھا تبھی اس نے اپنا منھ میرے قریب لا کر کہا.....''اے ....اس کے جوتے دیکھ۔'' اور فوراً میری نظر اس کے پیروں پر جم گئی۔ میں زور سے قہقہہ لگایا۔ توقیر بولتا رہا۔ ''ہو سکتا ہے یہ کسی سرکاری دفتر میں اونچے عہدے پر فائز ہو مگر یہ بتاؤ کہ اس کی شکل زیادہ مضحکہ خیز ہے یا جوتے؟'' میرے لیے واقعی یہ طے کرنا مشکل کام تھا۔ اہم بات جوتے کی قیمت نہیں تھی مگر ان کی بناوٹ اور کئی شوخ رنگوں نے یقیناً بہت مضحکہ خیز بنا دیا تھا۔ اس کے جوتے اس کی شخصیت کی کسی حد تک عکاسی کر رہے تھے۔ ہم لوگ دیر تک اسی کے بارے میں باتیں کرتے رہے اور محفوظ ہوتے رہے۔

عورتیں حسب عادت کپڑے اور زیورات پر تبادلۂ خیال کرتی رہیں۔ بچے نئے Games اور ہالی وڈ (Hollwood) کی فلموں کے بارے میں۔ ہم دونوں ماضی کی بگھی میں سوار روشنی کی تلاش میں تاریک شاہراہوں پر نکل پڑے۔ یہ جگہ جہاں عالیشان وسیع و عریض عمارت بنی ہوئی ہے، یہاں کبھی شہر کا زنداں ہوا کرتا تھا۔ Infrastucture میں تبدیلی کے زیر اثر کئی محکمے اور عمارتیں شہر سے دور منتقل کر دی گئی تھیں۔ جیل کے عقب میں ایک پارک بھی ہوا کرتا تھا۔ جہاں ہم لوگ بچپن میں کرکٹ کھیلا کرتے تھے۔ ہماری کتنی یادیں اس پارک سے وابستہ تھیں۔ ذہن میں پیڑ پودوں سے بھرا سبز میدان آج بھی تازہ ہے۔

ایک روز دوکان کھول کر میں نے صفائی شروع ہی کی تھی کہ توقیر کی گاڑی رکی۔ وہ اکثر فیکٹری جاتے وقت صبح بھی آجایا کرتا تھا۔ اس لیے اس میں تعجب یا تشویش جیسی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ اندر آیا تو میں نے دیکھا اس کے ہاتھ میں جوتے کا ایک ڈبہ تھا۔ جو اس نے فوراً مجھے تھما دیا... تمہارے لیے۔ ''دراصل ابھی شو (Shoe) کا کام شروع کیا ہے۔ پہلی Consignment میں سے دو جوڑی اپنے اور تمہارے لیے نکال لیں۔ تمہارے پیر کی ناپ تقریباً میرے ہی جیسی ہے اس لیے Fitting کا مسئلہ تو شاید نہ ہو.... اب یہ دیکھ لو کہ تمہیں پسند ہیں یا نہیں۔'' میں نے ڈبہ کھول کر دیکھا۔ وہ یقیناً بہت قیمتی جوتے تھے اور میری قوتِ خرید سے باہر بھی۔ چیز ہاتھ میں آتے ہی اپنی قیمت کا اندازہ کرا دیتی ہے۔ اس سے بھی اہم یہ کہ وہ چیز تکلیف یا لحاظ کے بغیر بھی پسند ہے یا نہیں۔ ''بھلا..... یہ کسے پسند نہیں آئیں گے۔'' میں اتنا ہی کہہ پایا۔ تذبذب بھی تھا کہ شکریہ ادا کروں یا نہیں۔ اسی وقت وہ پھر گویا ہوا... ''یار.... میں آج تم سے کچھ خاص بات کرنے آیا ہوں بلکہ کچھ راز منکشف کرنے۔'' اس جملے کے ساتھ جانے کتنے اندیشے وسوسے ذہن میں لہرا گئے۔ خیریت... تو.. ہے.... کہیں مجھ سے تو کوئی گڑبڑ نہیں ہوگئی؟ خود کلامی کے سے انداز میں ہمزاد سے مخاطب تھا۔ ''ایک بات جو میں نے تم سے آج تک چھپائی اور جو میرے لیے اب مزید دبائے رکھنا شاید ممکن نہیں۔ میں اس وقت تمہیں وہی بتانے آیا ہوں۔ کل موقع نہیں ملا ورنہ میں کل ہی بتانے والا تھا۔ میں محو حیرت بس اُسے ہی دیکھے ہی جا رہا تھا۔ جانے..... کیا.... بات ہو..... ڈر بھی لگ رہا تھا۔ اتنے برسوں کے بعد آج عجیب سی کیفیت میں مبتلا کر دیا تھا۔ ''اس کے بارے میں کافی کچھ تمہیں پہلے سے معلوم ہے۔ تمہیں یاد ہے کہ ابا نے ایک Firm میرے نام سے کھولی تھی۔'' اس جملے کے بعد میں راحت کی سانس لی کہ معاملہ کم سے کم مجھ سے متعلق نہیں۔ وہ آگے بولتا رہا۔ اس فرم کا مقصد کاروبار نہیں۔ دراصل ابا کے پاس کچھ

Black Mony تھی جسے وہ Incom tex سے چھپانا چاہتے تھے۔ ظاہر ہے میں ان کے لیے سب سے معتبر آدمی تھا۔ میرے کھاتے میں ایک کروڑ کی خطیر رقم ڈال دی گئی۔ مجھے نہ کچھ معلوم تھا اور نہ ہی اس کی ضرورت تھی۔ مجھے کچھ کرنا بھی نہیں تھا۔ ابا جہاں کہتے دستخط کر دیتا۔ وقتی طور پر ابا کو کچھ احتیاط برتنے تھے۔ یہ اقدامات اس کا نتیجہ تھے ابا کی سب جگہ سیٹنگ تھی۔ سرکاری محکمہ کے لوگوں نے ہی تجویز بھجائی تھی۔ اس کے لیے ظاہر ہے انھیں خاطر خواہ پیسے دیے گئے تھے۔ یہ باتیں کسی تیسرے کو نہیں معلوم تھیں۔ انھیں دنوں اچانک ابا کا انتقال ہوگیا۔'' میں کسی حد تک معاملہ کی تہہ تک پہنچ چکا تھا۔ وہ پھر گویا ہوا۔ ''اس ایک کروڑ روپے پر میرا ایمان ڈول گیا تھا۔ وہ خاموش ہوگیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ اس مزاج کا آدمی نہیں تھا لیکن کبھی کوئی ایک لمحہ کسی کو بھی کمزور بنا سکتا تھا۔ گناہ تو بہر حال سرزد ہو گیا تھا اور اس سے بچنے کا راستہ میرے پاس تو نہیں تھا۔ میں خالی الذہن ..... ہونق.... بنا قدرے توقف کے بعد دونوں ایک دوسرے سے نظریں چرا رہے تھے.... ہم..... دونوں خاموش تھے۔ یہ خاموشی بہت گراں گزر رہی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ ایسے میں کوئی گاہک ہی آجائے۔ میں سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ ایسے میں مجھے کیا کہنا چاہیے۔ اس کی آواز پھر سماعت میں گونجی۔ ''خیانت کے ساتھ میرا دوسرا جرم یہ تھا کہ میں نے تم سے یہ بات چھپائی..... چلتا..... ہوں۔ پھر بات کریں گے۔'' اس نے ہاتھ آگے بڑھایا۔ دو بوٹ کی طرح میرا ہاتھ بھی آگے ہوگیا۔ ہمیشہ گرم رہنے والے اس کے ہاتھ کا لمس آج قدرے یخ بستہ تھا۔ میں نگاہ سے دور ہوتے ہوئے توقیر کو دیکھ رہا تھا۔ میری نظر اچانک ہی اس کے جوتوں پر مرکوز ہوگئی ... یہ وہی جوتے تھے جس کی ایک جوڑی میرے سامنے رکھی ہوئی تھی... جوتے کے ڈبے کی طرح میں بھی خالی پڑا ہوا تھا۔

❁❁❁

www.urduchannel.in

آزادی

بس سری نگر پہنچی تب تک شام ہو چکی تھی حالاں کہ جموں سے سوار ہوتے وقت اسے اسی ایک بات کا اندیشہ تھا۔ اندھیرا اکیلے ہی خوف زدہ کرنے کے لیے کافی تھا اسی پر ایسے نا مساعد حالات میں شب خون کے امکان اور بڑھ جاتے ہیں۔ ایک تو راستے میں اترنے چڑھنے والوں کی وجہ سے بھی خاصی تاخیر ہوئی اور گھاٹی میں بس کی سُبک خرامی کے باعث بھی دیر ہوئی۔ ایک لمحہ کو ٹھہر کر اس نے کچھ سوچا۔ جو بھی ہونا تھا ہو چکا اب آگے کیا ہونا ہے اور احتیاط کے لیے کیا اقدامات کرنے ہیں، اس کے بارے میں غور و خوض زیادہ ضروری تھا۔

وہ آج کئی برسوں کے بعد کشمیر آیا تھا پر اُس کے باوجود اسے اچھی طرح یاد تھا کہ یاور کا گھر بس اسٹینڈ سے کوئی خاص دور نہ تھا۔ یاور اگر کسی وجہ سے اسے لینے نہ آ سکا تب بھی بغیر کسی دشواری کے وہ گھر پہنچ جائے گا۔ اچانک اسے خیال آیا کہ یہ اتنا آسان بھی تو نہیں جتنا ایک لمحے کے لیے نظر آیا تھا۔ سفر کے خطرات تو اب شروع ہوئے تھے۔ کیا معلوم کدھر سے گولیوں کی تڑتڑ آواز سنائی دے یا ہو سکتا ہے کہ آواز سننے تک کا موقع نہ ملے۔ اس خیال کے ساتھ بدن میں ایک جھرجھری سی دوڑ گئی۔ اس نے دل ہی دل میں دعا مانگی کہ خدا کرے

یاور اسٹیشن آ جائے۔ کتنے دنوں سے وہ کشمیر آنے کا ارادہ کر رہا تھا پر ہر بار کوئی نہ کوئی اپنی محبت کا واسطہ دے کر روک لیتا۔ کبھی دباؤ ڈال کر اُس نے اجازت حاصل کر بھی لی تو عین وقت پر کسی بڑی واردات کی خبر ملتی۔ تین چار مہینے تو موسم کی برف حوصلوں کو بھی ٹھنڈا کر جاتی۔ یاور اور وہ دہلی میں ایک ساتھ پڑھے تھے۔ یونیورسٹی میں یاور کی امیج ایک پڑھاکو اور ذہین طالب علم کی تھی۔ وہ بہت کم بولتا تھا۔ دس سوال پوچھو تو ایک دو کا جواب۔ بعض اوقات تو مجید جھنجھلا جاتا پر اُس کی عادت پھر بھی نہیں بدلی۔ کشمیر کے حالات پر گفتگو کرتے وقت اس میں حیرت انگیز تبدیلی نظر آتی۔ یقین کرنا مشکل ہو جاتا کہ یہ وہی یاور ہے۔ ہر کسی کے سامنے وہ کھلتا بھی نہیں تھا۔ پہلی بار جب اس نے لڑنے والوں کو مجاہد کہہ کر ان کی طرفداری کی تھی تو مجید پھٹی آنکھوں سے دیر تک اسے دیکھتا رہا تھا۔ آزادی کی لڑائی بتا کر اُس نے بالکل جائز ٹھہرایا تھا اور اگر موقع پڑے تو وہ خود بھی اپنی جان دینے سے پیچھے نہیں ہٹے گا۔ مجید دیر تک یاور کا منہ تکتا رہا تھا۔ گو کہ وہ چاہتا تھا کہ یاور خوب بات کرے، پر اس کے بعد یاور کی خاموشی ہی اسے اچھی لگنے لگی۔ کبھی کبھی تو اسے یاور سے ڈر بھی لگتا پر مراسم پر اس مطمح نظر کا ذرا بھی فرق نہیں پڑا۔

ڈگری ملنے کے بعد ملازمت کے لیے اسے بہت زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ اپنے ہی شہر کے ایک اچھے کالج میں لیکچرر شپ مل گئی۔ اس بات کو گزرے کئی سال ہو گئے۔ نوکری کی مٹھائی کھانے اور سنہری یادوں کو پھر سے تازہ کرنے کی غرض سے ہی مجید بالآخر کشمیر پہنچ گیا۔

شاید یہ سفر اس بار بھی ٹل جاتا پر یاور نے لکھا تھا کہ کیا مئی میں ہی آؤ گے .....اور بس خط کے جواب میں وہ خود ہی چل دیا۔

مضافاتی علاقوں سے گزرتے ہوئے اور شہر کی حدود میں داخل ہونے سے پہلے

www.urduchannel.in

پلٹ ڈیوٹی پر تعینات پولس کا عملہ ہر گاڑی کو روک کر باریکی سے جانچ پڑتال کرتا۔ بی ایس ایف کے 6 جوان پاس ہی کرسی ڈالے نہایت اطمینان سے گفتگو کر رہے تھے مگر ان کی نگاہیں چوکسی برت رہی تھی اور کسی بھی طرح کے حالات سے نمٹنے کے لیے پوری طرح تیار تھے۔ بس سے آگے والی جپسی کو جوان نے ہاتھ دے کر روکا، جس میں چار کشمیری بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں دو لوگ روئیوں میں ملفوف تھے۔ انہیں اوڑھے لپیٹے دیکھ کر مجید کو سردی کا احساس ہوا تب تک دو جوان گاڑی کے قریب آ ٹپکے تھے۔ ان کی نظروں کا تصادم ہوا۔ ایک سپاہی نے استفسار کیا۔

''کچھ ہے..... تو ..... نہیں.....؟ جواب میں جپسی کے اندر بیٹھے ایک شخص نے شال کے اندر سے رائفل یا بندوق کی نال جوان کے ہاتھ میں تھما دی۔ ''بس ..... یہ ہے.....'' باقی لوگ قہقہہ مار کر ہنسے۔ جوان اس طرح اچھلے جیسے ان پر زہریلا سانپ چھوڑ دیا گیا ہو۔ وہ تیزی سے اپنے افسر کی طرف لپکے۔ ''آپ نے تو ابھی مروا ہی دیا تھا'' ان کے چہروں پر اڑتی ہوائیاں تک مجید نے بالکل واضح طور پر دیکھی تھی۔ ایک دم سے بھگدڑ مچ گئی۔ جپسی اب تک نگاہوں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ وہ بھی خوف سے تھر تھر کانپنے لگا۔ لمحہ بھر کو اسے لگا کہ شاید وہ اب یاور کے گھر خیریت سے پہنچ بھی پائے گا؟ جیب سے رومال نکال کر چہرے پر چھلک آئے پسینے کو صاف کیا۔ افراتفری میں بس ڈرائیور نے گاڑی تیزی سے آگے بڑھا دی۔ بس کی تمام سواریاں ڈری سہمی ہوئی تھی۔ مجید کے چہرے پر بھی فکر کی لکیریں کچھ گہری ہو گئی تھی۔ غیر ارادی طور پر اس نے گردن گھما کر پیچھے کی طرف دیکھا۔ پچھلی نشستوں میں آٹھ دس کشمیری بیٹھے ہوئے تھے۔ دوبارہ پیچھے دیکھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ دھڑکا سا لگا رہا کون جانے کس وقت گولیوں کی آواز سنائی دینے لگے۔ تمام کھڑکیوں کے شیشے بند تھے۔ مجید دل ہی دل میں قرآنی آیات کا ورد کرنے لگا۔ خواہ مخواہ کیوں جان

خطرے میں ڈال دی۔ اسے آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ وہ اپنے آپ سے جھگڑ رہا تھا اب تو جو ہونا تھا ہو چکا مگر اب اس سے کیا حاصل؟ اس کے اختیار میں کیا ہے؟ کون جانے کہاں سے گولی چلے اور اس کی کہانی کا عنوان رکھ دے۔ وہ اپنے ہی خیالوں میں الجھا ہوا تھا کہ ایک وین اس کے برابر سے گزری۔ گاڑی کا اسٹوڈیوفل والیوم میں بج رہا تھا۔ کئی لوگوں نے کھڑکی کے شیشے آدھے کھول دیے تھے۔

''مجاہدوں کا نعرہ ہے
یہ کشمیر ہمارا ہے۔''

''کشمیر آزاد ہو کر رہے گا..... کشمیر آزاد ہو کر رہے گا'' اشتعال انگیز نعروں کی آواز دھیمے پڑتے ہوئے معدوم ہو گئی۔ بس کے اندر اب بھی صحرائی سی خاموشی و ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ کسی کی ہلکی سی نقل و حرکت پر سانسوں کا توازن بگڑ جاتا۔ بس کے رکتے ہی مجید بھیڑ کو چیرتا ہوا دروازے کی طرف لپکا۔ وہ بھی سب سے پہلے اترنا چاہتا تھا پر اس کا نمبر کچھ کے بعد آیا۔ باہر آتے ہی یاور کھڑا ہوا دکھائی دیا۔ اسے دیکھنے کے بعد جان میں جان آئی۔ ایک گھنٹے سے کھڑا ہوں ''بس لیٹ کیسے ہو گئی''؟ اس نے پہلا سوال کیا۔

''اماں..... پہنچ ہی گئے..... مجھے تو لگ رہا تھا کہ خبر ہی پہنچے گی۔ مجید کی بات پر یاور مسکرا دیا۔ جواب میں نہ چاہتے ہوئے بھی مجید کو مسکرانا پڑا البتہ اپنے تبسم پر وہ تھوڑا متحیر ضرور تھا۔

اس رات وہ دونوں بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ جانے کہاں کہاں کی باتیں۔ کشمیر کے حالات بھی برسرِ تذکرہ آئے پر مجید کا لہجہ بدلا ہوا تھا۔ اسے لگا شاید یہ بھی خاطر مدارات میں شامل ہو۔ کالج کی باتیں بھی نکلی۔ شاید سائرہ کے ذکر کے لیے کالج سے ہی آغاز کرنا ضروری تھا اور پھر آخر تک سائرہ کی ہی باتیں ہوتی رہی۔ جس میں زیادہ تر یاور

www.urduchannel.in

ہی بولا۔مجید کوتھوڑا تعجب ضرور تھا کہ اتنا کم بولنے والا شخص کتنا باتونی ہوگیا ہے۔مرد کتنا بھی ہوشیار ہو،عورت کے معاملے میں جذباتی ہو ہی جاتا ہے حالاں کہ مجید جانتا تھا کہ یاور سائرہ سے سچی محبت کرتا ہے۔آگ تو سائرہ کے دل میں بھی لگی ہوئی تھی پر پہل کون کرے کے انتظار میں خاصا وقت نکل چکا تھا۔مجید کو لگا تھا کہ باقی وقت بھی اسی حماقت میں نکل جائے گا تو آگے بڑھ کر انجام کی پروا کیے بغیر سائرہ کو پوری داستان لاگ لپیٹ کر سنادی۔

پھر شروع ہوا ان کی ملاقاتوں کا سلسلہ۔کبھی لائبریری تو کبھی کینٹین میں دونوں گھنٹوں بیٹھے رہتے۔کیمپس سے باہر جانے کو سائرہ کبھی رضامند نہ ہوئی۔پرانے زمانے والا عشق جس کا آغاز بھی اسی انداز میں ہوا تھا۔قربت بڑھی تو معلوم ہوا سائرہ بہت گہری لڑکی ہے۔محبت کے معنیٰ اس کے نزدیک ٹائم پاس کے نہیں تھے۔یاور پر وہ دل وجان سے فدا تھی۔یاور نے کئی بار دست درازی کی کوشش کی جس کے جواب میں سائرہ نے فوراً اس کی حوصلہ شکنی کی۔وہ بات کرنے پر زیادہ زور دیتی مگر موضوعات کی حدیں متعین کردی تھی۔ ایک دن معلوم ہوا کہ سائرہ کی شادی کہیں اور طے ہوگئی ہے۔اس کے بعد وہ یونیورسٹی بھی نہیں آئی۔امتحان تک نہیں دیا۔بڑی تگ ودو کے بعد یاور کو فون پر بات کرنے کا موقع مل پایا۔اس نے سائرہ کو پریس کیا کہ وہ گھر کے کسی فرد کو اعتماد میں لے کر بات والدین تک پہنچادے۔اگر اس کی ہمت نہیں پڑتی تو وہ خود ہی بات کرلے گا۔دوپٹے کے کونے سے آنسو پوچھتے ہوئے اپنے عشق کا واسطہ دے کر اس نے یاور سے ایسا نہ کرنے کی قسم کھلوالی اور سسکتے ہوئے یہ بھی کہا کہ وہ آخری سانس تک اسے یاد کرتی رہے گی۔

عشق کرنے کے بعد باغی نہ ہونے کا جرا شاید مرتے دم تک دونوں سے خراج وصول کرتا رہے گا۔جب کبھی سائرہ کا تذکرہ ہوتا یاور یہ ضرور پوچھتا کہ سائرہ اسے یاد کرتی ہوگی یا نہیں۔اس سوال کا جواب مجید کے پاس نہیں تھا پر وہ ہمیشہ اثبات میں ہی گردن

ہلاتا۔مجید نے گھڑی پر نظر ڈالی صبح کے تین بج رہے تھے۔یاور نے کہا ''اب سوجاؤ باقی باتیں بعد میں ہوگی۔''

مجید کے حواس پر بھی غنودگی طاری ہونے لگی تھی کہ دور کہیں سے گولیوں کی آواز سنائی دی۔شاید کہیں کراس فائرنگ ہو رہی تھی۔وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔یاور نے کہا لیٹے رہو.....یہ کوئی خاص بات نہیں ہے۔'' وہ پھر سے لیٹ گیا مگر نیند آنکھوں سے بہت دور تھی۔اُسے ڈر بھی لگ رہا تھا۔اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی یاور نے بغیر پوچھے دروازہ کھول دیا۔لمحہ بھر کو وہ یاور کے طریقے پر چونکا تھا۔ناگوار بھی گزرا پر لحاف کے اندر دبکا رہا۔ایک ایک کر کے تین لوگ اندر آئے۔تینوں مرد تھے اور جوان تھے۔بدنوں پر لوئیاں پڑی ہوئی تھی۔ہلکی روشنی میں بھی مجید نے آگے والے شخص کو پہچان لیا۔یہ تو اطہر تھا۔یاور کا چھوٹا بھائی۔کتنا لمبا چوڑا ہوگیا ہے۔اتنی رات گئے بغیر سامان کے کہاں سے آرہے ہیں یہ لوگ؟ اب تک وہ لحاف جھٹک کر اٹھ بیٹھا تھا۔

''السلام علیکم.....'' اطہر نے اسے دیکھتے ہی کہا۔جواب دے کر وہ اس کے قریب آگیا۔''تم اتنی رات گئے.....میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی اس نے یاور کی طرف دیکھا بڑی معنی خیز انداز میں۔شاید جواب اسے معلوم ہو چکا تھا پر مبادا اس کا خیال غلط بھی تو ہوسکتا ہے۔

''میں صبح تمہیں تفصیل سے بتاؤں گا.....'' یاور نے مجید سے کہا۔تم آرام کرو، رات بہت ہوچکی ہے۔'''' رات تو واقعی بہت ہوچکی ہے۔'' زیرلب وہ بُدبدایا تھا۔اپنے بستر کی طرف لوٹ گیا۔وہ سب دوسرے کمرے میں چلے گئے۔سرگوشیاں سی سنائی دیں۔ لحاف منہ پر ڈال کر مجید سیدھا ہوگیا۔پانچ سات منٹ بعد دروازہ بند ہونے کی آواز سنائی دی۔اس نے چہرہ باہر نکالا۔سامنے یاور کھڑا ہوا اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔''میرے خیال

www.urduchannel.in

میں تمہیں مزید کچھ بتانے کی ضرورت تو نہیں.....۔''

''نہیں بالکل نہیں.....'' کہہ کر مجید اٹھ بیٹھا۔دونوں کے چہروں پر تفکر تھا مگر معنی ایک سے نہیں تھے۔

''دراصل اطہر کا ایک دوست ہے فضل..... پانچ مہینے پہلے فوجیوں نے اس کی بہن کا ریپ کیا تھا جس کی وجہ سے اس نے خودکشی کر لی''۔

''فضل نے.....''؟

''نہیں اس کی..... بہن..... نے.....۔دوسرا لڑکا مسعود تھا جس کے بھائی کو پولس نے گھر سے لے جا کر گولی ماردی۔تب سے یہ دونوں مجاہدوں کے ساتھ ہیں...۔''

''اور اطہر.....؟'' مجید نے آگے سوال کیا۔

''وہ دوستی کا حق ادا کر رہا ہے۔حالاں کہ اطہر پہلے ان کے ساتھ نہیں تھا پر دن میں کئی بار پولیس کی گاڑیاں یہاں آنے لگیں.....اس کے .....بعد.....ایک گہری سانس لے کر وہ خاموش ہو گیا۔

''اطہر کو تم نے روکنے کی کوشش نہیں کی''۔مجید نے استفسار کیا۔

''کی تھی..... مگر اس سفر سے واپسی ممکن نہیں۔کہتا ہے بزدلی کی سو سالہ زندگی سے شجاعت کے ایک دن کی حیات بہتر ہے''۔

''تمہیں کیا لگتا ہے اطہر بہادر ہے یا بزدل.....۔؟'' مجید نے یاور کی دکھتی رگ پر انگلی رکھ دی۔

''مجھے نہیں معلوم..... پر یہ لڑائی مجھے غلط نہیں لگتی.....'' اس بار مجید چونکا تھا۔ وہ یاور کو حیرت بھری نظروں سے دیکھتا رہا۔کچھ دیر تک دونوں خاموش رہے۔مجید نے دوبارہ لیٹتے ہوئے اتنا ہی کہا.....''تم بھی سو جاؤ.....پھر بات کریں گے اس موضوع پر

.....۔''

صبح نو بجے مجید کی آنکھ کھلی۔تب تک یاور نہا دھو کر تازہ دم ہو چکا تھا۔

''تم ابھی تک کالج نہیں گئے؟'' اس نے یاور سے دریافت کیا۔

''میں نے درخواست بھیج دی ہے۔اگر میں کالج چلا جاتا تو تم یہاں اکیلے رہتے''۔نظریں چراتے ہوئے اس نے اپنی بات پوری کی۔مجید معاملے کی نزاکت بخوبی سمجھ رہا تھا۔ماحول کو خوشگوار رُخ دینے کی غرض سے وہ بولا۔اماں.....اب شادی.....وادی کر لو ..... کب تک خود ہی ہنڈیا چولہا کرتے رہو گے۔مسئلہ اگر صرف گھر گرہستی سنبھالنے کا ہوتا تو شاید میں نہ کہتا.....'' بات ختم ہونے سے پہلے یاور مسکرا پڑا۔

تھوڑی دیر بعد جب مجید نہا کر نکلا تو چائے تیار تھی۔ایک ہاتھ میں چائے کا کپ سنبھالے دوسرے ہاتھ سے تولیہ سے سر پونچھتا ہوا وہ میز کے قریب آیا جہاں آڈیو سی ڈی رکھا ہوا تھا۔پاس ہی غزلوں کے کچھ نئے پرانے سی ڈی بھی پڑے ہوئے تھے۔غزلوں کا شوق یاور کو مجید سے زیادہ تھا اور اس سے پرانا بھی۔ایک سی ڈی لگا کر اس نے پلیر آن کیا اور آ کر آرام سے کرسی پر دراز ہو گیا۔تبھی نعرۂ تکبیر کی بلند آواز اس کے کانوں میں پڑی۔یقیناً یہ صدا باہر سے نہیں آئی تھی۔اب تک وہ پلیر کے پاس آ چکا تھا۔جذبات سے مغلوب واشتعال انگیز تقریر شروع ہو چکی تھی۔والیوم کم کر کے وہ تقریر سننے میں منہمک ہو گیا۔

پندرہ منٹ کے بعد اس نے پلیر آف کر دیا اسی وقت یاور آ گیا وہ شاید باہر سے کچھ لینے گیا تھا۔آتے ہی بولا''تم ابھی تک تیار نہیں ہوئے''۔

آدھے گھنٹے بعد دونوں گھر سے نکلے۔یاور مسلسل بولے جا رہا تھا جب کہ مجید صرف ہاں، ہوں سے گفتگو میں شریک تھا پر یاور نوٹس نہیں کر سکا۔کچھ دور چلنے کے بعد یاور نے گاڑی روکی۔پوچھنے سے پہلے ہی یاور نے بتایا''آؤ تمہیں وہ مسجد دکھاؤں جس پر

www.urduchannel.in

مجاہدوں نے قبضہ کر رکھا تھا''۔''یاور تم بار بار جنہیں مجاہد کہہ رہے ہو کیا وہ واقعی مجاہد ہیں .....؟ کافی دیر بعد مجید گویا ہوا۔''انتہا پسند یا آتنک وادی کم سے کم میں تو نہیں کہہ سکتا ..... ''فیصلہ کن لہجے میں اس نے جواب دیا۔

''ہوں .....!!''ایک گہری سانس لے کر مجید نے یاور کی طرف دیکھا۔اب تک دونوں مسجد کے صحن میں آچکے تھے۔یاور نے مجید سے بھی دو رکعت نفل پڑھنے کو کہا اور خود وضو کے لیے بیٹھ گیا۔سرگوشی کی سی انداز میں وہ مجید کو بتا رہا تھا کہ کس جگہ پر کیا ہوا تھا ۔چھجے سے وہ مقام بھی دکھایا جہاں پولیس کا عملہ خیمہ زن تھا۔مسجد کے اندر گنتی کے لوگ تھے جو انہیں شک کی نظر سے دیکھ رہے تھے۔ان کے چہروں پر سوالیہ نشان تھے۔خوف و ہراس میں لپٹے ،رکوع وسجدہ ادا کیے اور مجید تقریباً اپنے آپ کو گھسیٹ کر باہر لایا جب کہ یاور کی صورت حال اس کے برعکس تھی۔نہ چاہتے ہوئے بھی اسے باہر آنا پڑا۔واپسی میں یاور نے دوسرے راستے کا انتخاب کیا۔اس نے مجید کو قبرستان بھی دکھایا۔سینکڑوں تازہ قبروں کی وجہ سے قبرستان کی حدیں کافی آگے تک پھیل گئی تھیں۔گھنے اور سایہ دار درختوں کو عبور کرتا ہوا مجید یاور کے پیچھے چل رہا تھا۔لوح مزار پو مدفون کے نام ولدیت اور شہید ہونے کی تاریخ پڑھتا ہوا کچھ فاصلے پر جا کر کھڑا ہو گیا۔آگے کی خالی زمین کو دیکھتے ہوئے جو قبروں اور کتبوں سے خالی تھی۔

''کچھ نظر آرہا ہے..... تمہیں.....؟''مجید نے یاور کو مخاطب کیا۔قبرستان کی ویرانی اور سراسیمگی جیسے اس کے لہجے میں اُتر آئی تھی۔

''ہاں.....بہت واضح.....ہے.....۔''یاور کا جواب ایکدم سپاٹ تھا۔

''یاور کچھ کرو.....روکو.....انہیں..... آگ اور خون کا یہ تماشا بند ہونا چاہیے۔''جذبات رو میں بہہ کر وہ جانے کیا کیا کہتا رہا۔اس اثنا میں یاور مجسمہ حیرت بنا

رہا۔قدرے توقف اس کے لبوں میں جنبش ہوئی۔

''میں نہیں روک سکتا.....میں تو فضل اور مسعود کو نہیں روک سکتا۔تم چاہو تو کوشش کر کے دیکھ لو شاید تمہاری مان جائیں''۔یہ کہہ کر اس نے گاڑی میں Kick ماری۔وہ خاموشی سے یاور کے پیچھے بیٹھ گیا۔گاڑی جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔

''مجھے ان سے کوئی بات نہیں کرنی ہے۔میں یہاں کسی اصلاحی مشن پر نہیں آیا ہوں۔کسی حد تک میں بھی فضل و مسعود کی ہی طرح سوچتا ہوں لیکن آزادی کی ایک لڑائی ہم پہلے بھی لڑ چکے ہیں۔کامیاب بھی ہوئے۔حالاں کہ میں اسے کامیابی نہیں مانتا۔مہاجر کی قومیت وہاں پاسپورٹ سے زیادہ نہیں ہے۔وہ جنگ بھی ایسے ہی خوابوں کو لے کر لڑی گئی تھی۔آگے کوئی اور لڑائی نہیں ہوگی اس کی گارنٹی کون لے گا.....؟''تم کہنا کیا چاہتے ہو؟ یاور نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''لڑائی ، بربریت اور غارت گری کے خلاف ہے تو بات سمجھ میں آتی ہے۔میں جو کہنا چاہ رہا ہوں.....تم خوب اچھی طرح سمجھ رہے ہو''۔مجید اب تک کافی مشتعل ہو چکا تھا۔''یاور.....تم مجھے.....بتاؤ.....فضل اور مسعود جیسے کچی عمر کے لڑکے جس آزادی کا خواب دیکھ رہے ہیں وہ اگر مل بھی جائے تو فضل کو آزادی ملنے کی خوشی زیادہ ہوگی یا بہن کی عصمت لٹنے کا غم.....اس سوال کا جواب کسی اور کو نہ دینا ہو تو..... زندگی بچے گی تو آزادی کا لطف آپ ہی آئے گا۔بائیک کسی ریستراں میں روکو بہت عمدہ چائے پینے کا جی چاہ رہا ہے.....''یاور نے کسی سوال کا جواب نہیں دیا اور گاڑی کی رفتار حیرت انگیز کی حد تک تیز کر دی۔سڑک پر صرف موٹر بائیک کا شور باقی رہ گیا تھا۔

❁❁❁

www.urduchannel.in

تشنگی

ماہ جون کا وسط تھا۔ دن بھی آدھا ہی گزرا تھا۔ بارہ بجنے والے تھے۔ ان ایام میں بھی موسم خوشگوار ہوسکتا ہے مگر فی الحال ایسا نہیں تھا۔ سخت دھوپ کے ساتھ ہوا بھی ایک دم رکی ہوئی تھی۔ میں جس ٹرین میں سوار تھا وہ ابھی منزل سے دور تھی۔ جس اسٹیشن پر مجھے اترنا تھا، وہاں ریل کے پہنچنے کا وقت ہو چکا تھا۔ کئی تیز گام گاڑیوں کو پاس کرنے کی وجہ سے اسے کئی بار راستے میں روکا گیا۔ اس کے علاوہ بھی گاڑی دو بار بیابان میں کھڑی ہوگئی۔ مجھے اس کی وجہ بھی نہ معلوم ہوسکی۔ تاخیر کا ہر لمحہ میرے لیے ذہنی اذیت اور کرب کا باعث بنتا جارہا تھا۔

دراصل ملازمت کے سلسلے میں ایک انٹرویو کی غرض سے مجھے جس شہر میں پہنچنا تھا، ریل کی سست رفتاری اور بار بار رک جانے کی وجہ سے ابھی تک نہیں پہنچ سکا تھا۔ میں بری طرح اوب چکا تھا مگر مسئلے کا حل میرے پاس نہیں تھا۔ اس وقت جس مقام پر ٹرین کھڑی تھی وہاں سے اسٹیشن بہت دور نہیں تھا۔ مقامی لوگوں سے پوچھنے پر معلوم ہوا تھا کہ فاصلہ اتنا کم بھی نہیں تھا کہ پیدل ہی جاسکوں۔ ٹیمپو یا آٹو چوں کہ یہاں سے دستیاب نہیں تھے ورنہ میں

کب کا اتر چکا ہوتا۔ نئی جگہ ہونے کی وجہ سے واقفیت نہیں تھی۔ اس کا بھی تاوان ادا کرنا پڑ رہا تھا۔ اب سوائے اس کے کہ مجھے جتنی گالیاں آتی ہیں، زیر لب ان کی گردان کروں۔ گو کہ تاخیر ابھی اس درجہ نہیں ہوئی تھی لیکن نہ پہنچ پانے کا خدشہ محسوس ہونے لگا تھا۔

چلتی ہوئی گاڑی میں ہوا بہر حال لگتی رہتی ہے لیکن ٹرین کے رک جانے سے ہوا کے جھونکوں کا احساس بھی ختم ہوگیا تھا۔ گرمی حال سے بے حال کیے ہوئے تھی۔ یہ ایک علاحدہ مسئلہ تھا۔

ٹرین کی جنرل بوگیوں میں ہی نہیں دوسرے درجہ کے ڈبوں میں بھی ہندوستان کا حقیقی رنگ دیکھنے کو ملتا ہے۔ مختلف علاقوں کے لوگ مختلف بولیوں کے ساتھ اپنی اپنی لن ترانیاں ہانکتے ہوئے۔ حالانکہ جب میں سوار ہوا تھا تب سے کافی دیر تک ان کی باتوں کا لطف لیتا رہا مگر ٹرین کی غیر معمولی تاخیر کے سبب مجھے اب الجھن ہونے لگی تھی۔ میں ڈر رہا تھا کہ کہیں تھوڑی دیر اور ہوگئی تو میرا انٹرویو کرنے سے ہی منع کر دیں۔ ایک ذمے دار آدمی ہونے کی میں چاہے جتنی دلیلیں پیش کروں پر ایک بھی نہ سنی جائے گی۔ .M.B.A کی ڈگری اور دیگر تعلیمی اسناد میرا کچھ نہ بنا سکیں۔ مبادا ایسا ہوگیا .....تو.....ان کا.....کیا..... بگڑے گا.....مگر.....میرا.....اف.....اس کے آگے سوچنا میرے لیے مشکل ہو رہا تھا۔

ادبی اور نیم ادبی رسائل کے مطالعے کا شوق شروع سے تھا۔ اس شوق نے زندگی کو الگ ہی نظریے سے دیکھنے کا ہنر سکھایا تھا۔ اپنی خوبیاں بیان کرنا مقصد نہیں لیکن شروع سے کوشش یہ رہی ہے کہ طرز زندگی اصول وضوابط کے دائرے میں گزرے۔ بڑے خواب نہیں دیکھے تھے اس لیے بڑے مسائل سے سابقہ بھی نہیں پڑا۔ والدین کی تربیت اور گھر کا ماحول بھی کچھ ایسا ہی رہا ہے جس کی وجہ سے بہت آسانیاں ہوتی گئیں۔ بیش تر معاملات میں حد درجہ محتاط بھی رہا ہوں۔ اسی احتیاط کے سبب کچھ زیادہ وقت لے کر چلا تھا مگر ہمارے

www.urduchannel.in

سسٹم کی بے احتیاطی کہیں زیادہ تھی۔ وقت کی اہمیت ویسے بھی یہاں اکثر لوگوں کے لیے مسئلہ نہیں تھی۔

میں سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ ایسے میں مجھے کیا کرنا چاہیے۔ پیاس کی شدت بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے تک میرے پاس پانی کی بوتل تھی، اگرچہ اس کا پانی گرم ہو گیا تھا مگر تشنگی زیادہ ہو تو وہ پانی بھی مزا دیتا ہے لیکن یہاں اپنے محتاط رویے اور عقل مندی سے مجھے شرمندہ ہونا پڑا۔ تھوڑی دیر پہلے ہی رومال بھگو کر پانی سمیت بوتل باہر پھینک دی تھی۔

ماؤں کی گودوں میں دبکے بچے گرمی سے پریشان تھے حالاں کہ وہ انھیں اخبار وغیرہ سے ہوا کر رہی تھیں مگر بچے بری طرح چیخ رہے تھے۔ قوت برداشت تو بڑوں کی بھی جواب دے رہی تھی وہ تو بہر حال بچے تھے۔ گود کے بچے تو یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ کون سی افتاد آن پڑی ہے۔ عجیب افراتفری کا عالم تھا گو کہ خاصے لوگ نیچے اتر گئے تھے مگر اس کا کوئی مثبت اثر کمپارٹمنٹ کے اندر قطعی نظر نہیں آ رہا تھا۔ بوگی کے اندر جتنے لوگ میری نگاہوں کی دسترس میں تھے سب کی شکلیں دیکھ کر میں اکتا گیا تھا حالاں کہ اچھی شکل وصورت کی دوشیزائیں اور خواتین بھی تھیں مگر ذہنی شکست وریخت ادھر توجہ کرنے اور محظوظ ہونے میں آڑے آ رہی تھی۔ پسینہ چوتا ہوا تلوؤں تک پہنچ گیا، جوتے سے پیر باہر نکالے۔ میرے موزے بدبو نہیں کرتے ہیں اس لیے اغل بغل والوں کو بھی کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ موزے کے اندر کئی بار انگلیوں کو موڑا اس سے کچھ راحت محسوس ہوئی۔

نگاہ ایک بار پھر کھڑکی کے باہر گئی۔ اس بار میں نے چیزوں کو زیادہ غور سے دیکھا۔ جیسے پٹریوں کے کنارے اکثر لوگ چھپر ڈال کر ایک چھوٹی موٹی بستی آباد کر لیتے ہیں۔ کچھ ایسی ہی صورت یہاں بھی نظر آ رہی تھی۔ پٹری کے برابر دور تک قطار بند ڈربے نما ایک سلسلہ جیسے پالتو جانور رہتے ہوں۔ گھر تو کیا انھیں مرغے، مرغیاں، آوارہ کتے بھی نظر

آ رہے تھے۔ عقب میں بہت سی بے ترتیب جھونپڑیاں بھی تھیں بلکہ ایک چھوٹی سی بستی آباد ہو گئی تھی۔ ٹین کی زنگ آلود چادریں اور کھپریل پر رنگ برنگی پلاسٹک کی پنیاں ڈالی گئی تھیں اور تقریباً ہر چھپر پر سائیکل کے بہت سارے ٹائر پڑے ہوئے تھے۔ اینٹیں اور گملے بھی وافر مقدار میں تھے۔ اینٹوں کی ضرورت تو تھوڑی بہت سمجھ میں آ رہی تھی پر ٹائروں کا استعمال میری فہم سے باہر تھا۔

بالٹیوں کی جگہ پینٹ کے چھوٹے بڑے پرانے ڈبے، برتن کے نام پر ایلومینیم کے کچھ ٹھیکرے، تامچینی اور اسٹیل کی رکابیاں، ایک چبوترے پر جہاں کچھ اینٹیں بچھا کر عارضی غسل خانہ بنایا گیا تھا، وہاں پڑے ہوئے تھے۔ ڈھلان سے گرنے والا گندا اور بدبودار پانی کیچڑ بن کر کئی جگہ جمع تھا۔ پٹریوں کے کنارے اور جھاڑیوں میں ان کا بیت الخلا دائمی طور پر یہاں بھی موجود تھا۔

سانولی اور کالی پیلی عورتیں، لڑکیاں چوکھٹوں سے باہر ٹوٹی چارپائی اور ٹھیلوں پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ ایک خستہ حال تخت بھی بچھا ہوا تھا، جس کے دو پائے نہیں تھے۔ اینٹیں لگا کر انھیں روکا گیا تھا۔ اسی تخت پر دو عورتیں ٹانگیں پھیلائے بیٹھی تھیں۔ دونوں کے بال کھلے ہوئے تھے۔ لڑکیاں ان کے سروں میں جوئیں تلاش کر رہی تھیں۔ پٹ کی آواز بھی یقیناً ہو رہی ہوگی، جو بہر حال مجھے نہیں سنائی دے رہی تھی۔ تلے اوپر کے بہت سارے بچے جن میں لڑکیوں کی تعداد زیادہ تھی مختلف کاموں میں مصروف نظر آ رہے تھے، کچھ بچے کھیل رہے تھے۔ مجھے یاد آیا کہ اس طبقے کے بچوں کے لیے کھلونے ہونا ضروری نہیں ہے۔ ساتھ آٹھ اور اس سے اوپر کی عمروں کے بچے روزگار کی تگ ودو میں ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ کوئی پانچ کے پاؤچ لیے ہوئے تھا تو کوئی بالٹی میں پانی بھرے ڈبے کی مدد سے چلو سے پلا رہا تھا۔ پیاس لگتی ہے تو کوئی کچھ بھی کسی طرح سے پی سکتا ہے۔ کچھ لڑکے کھیرے، ککڑی، ناریل

www.urduchannel.in

کے ٹکڑے، مسالے، گٹکے کے پاؤچ ڈلیہ میں رکھے آوازیں لگا رہے تھے حالانکہ حسب ضرورت خریدار خود بھی انھیں آواز دے کر اپنی طرف بلا رہے تھے۔ بچوں کا مال خوب بک رہا تھا اس لیے وہ بہت خوش نظر آ رہے تھے۔ ان چیزوں کی ضرورت اکثر لوگوں کو تھی۔ بچوں کی گندگی ان کے دھندے میں کوئی اڑچن نہیں پیدا کر رہی تھی۔ ایک آدھ کی تو ناک تک صاف نہیں تھی۔

ایسی بستیوں میں زیادہ تر مزدور، کباڑ اور پھیری والے لوگ رہتے ہیں۔ موقع ملنے پر غلط اور ناجائز کام کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے ہیں۔ کہنے والے تو یہ بھی کہتے ہیں کہ ان بستیوں کی لڑکیاں، عورتیں بردہ فروشی تک کرتی ہیں۔

اچانک خیال آیا کہ کیا یہ منظر .A.C کوچ سے بھی ایسا ہی نظر آ رہا ہوگا۔ اتنا صاف اور اتنا واضح۔ ذہن فوراً خیال کی نفی کرتا ہے۔ وہاں درمیان میں ایک موٹا اور کالا شیشہ حائل ہے جو منظر کو دھندلا اور سیاہی مائل بناتا ہے۔ اندر سے باہر کا تو اتنا دِکھ بھی جاتا ہے مگر باہر سے ہم کچھ بھی نہیں دیکھ سکتے کیوں کہ روشنی میں ان شیشوں پر پردے پڑ جاتے ہیں۔

میں اپنے بھٹکے ذہن کو واپس اسی طرف لاتا ہوں۔ ٹرین کے آگے بڑھنے کا اب تک کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔ بار بار موبائل نکال کر وقت دیکھ رہا تھا اور ہر بار افسردگی بڑھتی جا رہی تھی۔ وقت جیسے جیسے آگے بڑھ رہا تھا میری امیدیں پیچھے ہٹتی جا رہی تھیں۔

سامنے والی سیٹ پر بیٹھے دو لڑکے کرکٹ کے نئے روپ پر تبادلۂ خیال کر رہے تھے۔ ان کی گفتگو سے معلوم ہوا کہ انھیں کرکٹ میں دلچسپی تو ہے مگر معلومات بڑی واجبی سی ہیں۔ میرے دائیں طرف جو موصوف تھے وہ ذات کے برہمن تھے، کسی سرکاری اسکول میں پڑھاتے تھے۔ دو برس قبل سبکدوشی اختیار کر چکے ہیں لیکن خود کو اب بھی 'ماس صاحب

'ہی سمجھتے ہیں۔ ٹرین کے چھوٹنے سے پہلے جو بولنا شروع کیا تھا وہ اب تک جاری تھی حتیٰ کہ ٹرین ہار کر خاموش ہوگئی مگر پنڈت جی تھے کہ بولتے ہی جا رہے تھے۔ ان کی جھک اتنی ناگوار لگ رہی تھی بلکہ طبیعت اس لیے مکدر تھی کہ ہم سب کو اپنا طالب علم سمجھ رہے تھے۔ حالاں کہ میں ان کی گفتگو میں سوال کرنے کی حد تک بھی شامل نہیں ہوا۔ علم نجوم پر ایک لیکچر سننے کے بعد جی بہت چاہا تھا کہ دریافت کروں کہ اس سال عشاق بتوں سے کیا فیض پائیں گے؟

نگاہ ایک بار پھر کھڑکی کے باہر جاتی ہے۔ منظر میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی۔ ایک لڑکا غالباً سات آٹھ برس کا ہوگا۔ ایک دم سیاہ بھجنگ اس کا یہ رنگ شاید قدرتی نہیں تھا۔ دھوپ کی تپش اور حالات کی گرمی نے اسے سیاہ فام بنا دیا تھا۔ یہ لڑکا مجھے پہلے نظر نہیں آیا تھا۔ ممکن ہے رہا ہو، میں ہی نہ دیکھ سکا ہوں۔ اشیا بیچنے والے لڑکے منتشر بھی ہو گئے تھے، اس کے پیروں میں پلاسٹک کی بہت بڑی چپلیں تھیں۔ غالباً اس کے باپ کی ہوں گی کیوں کہ وہ زنانہ چپلیں نہیں تھیں۔ ایک جوان اور بوسیدہ سی عورت پانی کے تین چار پاؤچ اسے تھما دیتی تھی اور وہ دوڑتا ہوا آگے کی بوگیوں کی طرف بھاگتا۔ چپلیں بڑی ہونے کی وجہ سے اسے دوڑنے میں دشواری ہو رہی تھی۔ زمین آگ کی طرح تپ رہی تھی۔ ایسے میں چپلیں اتارنا بھی ممکن نہ تھا۔ میں کھڑکی کی سلاخوں سے چپک کر اسے جاتا ہوا دیکھتا رہا۔ وہ ایک دم سے معدوم ہو جاتا اور لمحوں میں پھر سے منظر میں شامل ہو جاتا۔ واپسی میں اس کے چہرے پر ایک عجیب سی چمک ہوتی۔ اس کے ہاتھ خالی ہوتے۔ ظاہر ہے یہ تجارت کے منافع کا چراغاں تھا جو اُس کے کریہہ اور بدصورت چہرے پر روشنی بن کر چمک رہا تھا۔ وہ عورت جو اسے پانی کے پاؤچ تھما رہی تھی، شاید اس کی ماں تھی۔ اس کے چہرے پر بھی خوشی کے آثار نمایاں تھے۔ لڑکے کو پانی دینے کے بعد وہ لپک کر سامنے ایک گلی میں جاتی (شاید وہ ادھر ہی

www.urduchannel.in

رہتی تھی) اور فوراً پلٹ کر واپس آتی۔ اس کے ہاتھ میں نئے پاؤچ ہوتے۔ وہ ننگے پاؤں تھی۔ وہ دوپٹا بھی نہیں ڈالے تھی۔ ان کے ذاتی معاملات کے بارے میں سوچنے والا میں کون تھا؟ پر ذہن میں بات آئی کہ اس وقت اسے دوپٹے کی ضرورت زیادہ ہے یا چپل کی، جواب اپنے آپ سامنے تھا۔ دوپٹا یا اس کا متبادل اس کے پاس ضرور موجود تھا۔ چپلیں اس کے پاس شاید نہیں ہیں ورنہ اس آگ اگلتی زمین پر وہ یوں ننگے پاؤں نہ ہوتی۔ تو کیا وہ آج اتنے پیسے کما سکتی ہے کہ ایک جوڑی چپل خرید سکے۔ اگلے سوال کے ساتھ میں اس کے کاروبار کا حساب لگانے بیٹھ گیا۔ ایک روپے کا پاؤچ ہے، کتنے بیچ لیے ہوں گے اس نے یا ٹرین چلنے تک یہ کتنے فروخت کر لے گی۔ یہ اس بات پر منحصر ہے کہ ٹرین یہاں کتنی دیر اور کھڑی ہوتی ہے؟ مگر ٹرین کے زیادہ دیر تک کھڑے رہنے میں میرا تو نقصان ہی ہے۔ اس کے باوجود لاشعور میں کہیں اس کے لیے ہمدردی کا جذبہ کیوں محسوس کر رہا ہوں؟ کیا مجھ میں اور اس لڑکے میں کچھ یکسانیت ہے؟ میں اپنے آپ سے سوال کرتا ہوں۔ پسینے سے تر بنیائن پیٹھ سے چپک رہی تھی۔ جیب سے رومال نکالا تو اس میں بھی بدبو کا بھبھکا نکلا۔ کب سے اس سے پسینہ پونچھ رہا تھا۔ ایک بار پھر اسی کام کو دہرایا۔ رومال لپیٹ کر جیب میں رکھا اور یاد کرنے لگا کہ معاملہ کہاں پر چھوڑا تھا۔ کہتے ہیں کہ خالی دماغ شیطان کا گھر ہوتا ہے لیکن میں خالی الذہن بھی نہیں ہوں اور شیطانی باتیں تو میرے دماغ میں تب نہیں آئیں جب اس عورت کو دوپٹے کے بغیر چھاتیاں اچھالتے ہوئے دیکھا تھا۔ پھر کیا وجہ تھی جو میں خود میں اور اس لڑکے میں مطابقت تلاش کر رہا تھا۔ وہ غربت کی سفاک اور آہنی چکی میں پس رہا تھا اور میں.....؟ یہ سوال میں کسی سے کر رہا تھا۔ میں روزگار کی تلاش میں تھا پر میں مفلوک الحالی میں نہیں تھا۔ A.C. کمپارٹمنٹ اور تھری ٹائر بوگی میں سفر کرنے والے کے Status میں کس چیز کا فرق ہوتا ہے۔ ان پانی بیچنے والے بچوں کے بارے میں جو میرا نظریہ ہے، کیا ان

کا نظریہ ہم لوگوں کے بارے میں اس سے مختلف ہوگا۔ میں نے اپنے سر کو جھٹکا۔ یہ کن فضول کی باتوں میں الجھا ہوا ہوں۔ میں بات کو اپنے اور اس لڑکے تک ہی محدود رکھنا چاہتا تھا۔ یہ لڑکا جو مجھ سے بہت زیادہ محرومی کی زندگی گزار رہا تھا۔ کسی بے روزگار کا کرب سوائے بے روزگار کے کون جانتا ہے۔ حالاں کہ مجھے طعنے نہیں دیے جاتے۔ اشارے اور رویے میں تبدیلی محسوس کرنے والے شخص کو مطعون کرنے کی شاید ضرورت بھی نہیں ہوتی۔ میرے والدین سمجھ دار اور مہذب لوگ ہیں۔ جیسے کنواری لڑکی جس کے رشتے نہ آ رہے ہوں اور اس کی عمر نکلی جا رہی ہو۔ اس میں لڑکی کا کیا قصور ہے۔ کچھ ایسی ہی صورت حال سے میں نبرد آزما تھا۔

میں اتنی سی دیر میں بستی کے حالات اور پسماندگی دیکھ کر حیرت میں تھا۔ لوگ اس طرح بھی جیتے ہیں؟ ایسے لوگوں سے میرا کوئی خاص واسطہ نہیں پڑا تھا۔ اسی وجہ سے میرا مشاہدہ اور تجربہ بھی برائے نام تھا۔ ٹھہر کر دیکھنے کا یہ شاید پہلا اتفاق تھا۔ اس کے برخلاف ملک کے اقتصادی حالات بہت بہتر ہوتے جا رہے تھے۔ آج ریل میں ہی کسی اخبار کی ایک سرخی پر نظر پڑی تھی۔ Sensex اور اوپر چڑھا۔ ڈالر کے مقابلے روپیہ اور مضبوط ہوا۔ کس کا روپیہ؟ آہستگی سے میری زبان سے نکل بھی گیا تھا۔

اتنی دیر بعد یہ خبر آئی کہ آگے کسی ٹرین کو طلبا نے روک لیا ہے۔ پتھراؤ اور توڑ پھوڑ بھی کی ہے۔ اپنی مانگوں کو لے کر اپنی ہی چیزوں کو توڑنا میری سمجھ میں کبھی نہیں آیا۔ کالج اور یونیورسٹی کا میں بھی طالب علم رہا ہوں پر تخریب کی کسی تحریک میں شامل ہونے کی ہمت نہیں جٹا سکا۔ اس خبر کے ساتھ ایک خوف بھی لاحق ہوا۔ پتا نہیں کیسے حالات ہوں۔ جانا اب مناسب بھی ہوگا کہ نہیں۔ اس شہر میں میرا کوئی شناسا بھی نہیں ہے، جس سے تفصیلات معلوم ہو سکیں، امید اب ٹرین کے دیگر مسافروں پر آ ٹکی۔ لوگ موبائل پر حالات معلوم کر رہے

www.urduchannel.in

تھے۔ایک دو سے معلوم ہوا ہے کہ صورت حال زیادہ تشویش ناک نہیں ہے۔پولیس آ گئی ہے۔خدا کرے یہ خبر سچ ہو۔دل ہی دل میں دعا کی۔اس اطلاع سے ایک گونہ تسلی تو ہوئی۔

ساری افتاد آج ہی آنی تھیں۔ایک مسئلہ حل نہیں ہو رہا تھا دوسرا سامنے کھڑا تھا ہر چند کہ ابھی وقت باقی تھا مگر میں ناامید ہو گیا تھا کہ آج پہنچ بھی پاؤں گا۔پیاس کی شدت، قوت برداشت سے باہر ہو رہی تھی۔لڑکا پانی کے پاؤچ سنبھالے اس سے پہلے کہ دوڑنا شروع کرتا، میں نے آواز دی۔اس نے ٹھہر کر میری طرف دیکھا پھر اپنی ماں کی جانب دیکھا۔اور لوگ بھی اسے بلا رہے تھے پر وہ میری طرف آنے لگا۔

قریب آ گیا تو میں نے پوچھا ''کتنے کا ہے؟'' ''ایک.....روپیے.....کا''

''دو.....دے.....دو'' میں نے کہا۔قریب آنے پر نظر آیا کہ وہ توقع سے زیادہ گندا ہے۔کپڑے بھی چیکٹ تھے۔جسم پر میل کی پرتیں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔آنکھیں تک صاف نہیں تھیں۔اس پانی کو پینے کی میں ہمت جٹا بھی پاؤں گا یا نہیں یہ بہر حال بعد کا مسئلہ تھا۔لیکن مجھے اس سے پانی تو خریدنا ہی تھا۔میں نے دو پاؤچ لیے اور دس کا ایک نوٹ اس کی طرف بڑھایا۔وہ بولا ''چھٹا.....دو'' تب تک اس کی ماں بھی پاس آ گئی تھی۔

میں نے کہا چھٹے نہیں چاہئیں..... باقی بھی تم.....رکھ.....لو.....'' عجیب نظروں سے اس نے مجھے دیکھا۔پھر ایک دم سے ہنس پڑا۔ماں سے مخاطب ہوا۔''اماں اسے آٹھ روپیہ.....دے.....دے'' کہہ کر وہ تیزی سے پلٹ گیا۔مجھے پیسے واپس کر کے ماں بھی چلی گئی۔میں کچھ دیر تک مبہوت سا کھڑکی سے چپکا بیٹھا رہا۔اچانک ٹرین کا سائرن سنائی دیا۔یہ یقین نہیں تھا کہ اسی ٹرین کا ہے لیکن امید کی کرن ابھری۔باہر نکلے ہوئے لوگ بھی دروازوں کی طرف بھاگے۔شاید انھوں نے سگنل دیکھ لیا تھا۔ٹرین میں حرکت ہوئی، ایک

جھٹکا سا لگا اور وہ پھر ٹھہر گئی لیکن اگلے ہی لمحہ بالآخر چل پڑی۔راحت اور خوشی کا احساس ہوا۔فون نکال کر وقت دیکھا۔ابھی امید ہم باقی تھیں۔ٹرین دھیرے دھیرے رینگ رہی تھی۔میں نے دیکھا وہ لڑکا بھی ساتھ دوڑ رہا تھا بلکہ اس کی رفتار پہلے سے کہیں تیز تھی۔چہرے پر اچانک افسردگی و مایوسی طاری ہو گئی تھی۔دونوں ہاتھوں میں پانی کے پاؤچ سنبھالے دوڑ رہا تھا۔ٹرین کی رفتار کہیں تیز ہو گئی تھی۔اسے لگا کہ اب اس کی کوشش کامیاب نہ ہو گی اور پھر وہ ایک جگہ ٹھہر گیا۔اس کے چہرے کی چمک ذرا سی دیر میں غائب ہو گئی تھی۔میرے سامنے اس کے خوابوں کا محل مسمار ہو گیا تھا۔لگ رہا تھا جیسے وہ رو ہی دے گا۔اچانک مجھے جانے کیا سوجھی۔میں نے اٹھ کر زنجیر کھینچ دی۔حالاں کہ میں نے ایسا کچھ نہیں سوچا تھا۔مگر کبھی کبھی کچھ فیصلے آپ ہی آپ ہو جاتے ہیں۔لوگ مجھے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔کچھ کے چہروں پر برہمی بہت صاف دکھائی دے رہی تھی۔دو ایک لڑکوں نے تو ہتک آمیز جملے بھی کس دیے۔میں ان سب سے بے پروا باہر اس لڑکے کو دیکھ رہا تھا۔ٹرین رک گئی تھی مگر وہ بچہ دوڑ پڑا تھا۔پانی کے دو پاؤچ میرے ہاتھ میں تھے مگر اب مجھے پیاس نہیں لگ رہی تھی۔

(شعر و حکمت، حیدرآباد۔کتاب 10، دور سوم)

❁❁❁

www.urduchannel.in

دروبام

آخرکار چھ بھی بج گئے۔آج کی ڈیوٹی ختم ہوئی۔اطمینان کی ایک گہری سانس لے کر آفس کی بوجھل فضا سے باہر نکلا۔ٹریفک کا شور، بھاگم بھاگ، عام طور سے مجھے بالکل پسند نہیں لیکن دفتر سے نکلتے وقت تھوڑی دیر کے لیے یہ گرانی ختم ہو جاتی ہے۔

دہلی کبھی دل والوں کی ہوا کرتی تھی مگر اَب دماغ والوں کی ہوگئی ہے۔دو برس بعد بھی میں اس شہر سے اپنی وابستگی محسوس نہیں کر پایا اور اس کے لیے میں خود ہی ذمہ دار ہوں۔

آفس سے گھر تک آٹھ کیلو میٹر کا فاصلہ آٹھ چوراہوں پر ہری بتی کے انتظار میں دیر تک رکنے کے باعث فاصلے سے کئی گنا زیادہ محسوس ہوتا ہے۔

آج سڑکوں، بازاروں میں کچھ خاص طرح کی رونق نظر آرہی تھی۔لڑکیوں کی تعداد معمول کے برخلاف کچھ زیادہ تھی۔تبھی مجھے یاد آیا کہ آج 14 رفروری ہے۔اوہ تو یہ معاملہ ہے۔زیرلب میں بدبدایا تھا۔رانوں سے چپکی تنگ جینز یں پہننے والی دہلی کی لڑکیاں بھی اب ترقی کی دوڑ میں خود کو برابر کا شریک سمجھتی ہیں۔خوبصورت چہرے والی Slim لڑکیاں میری کلفت کو دور کر رہی تھیں۔فاسٹ فوڈ ریستوراں تک بھرے ہوئے نظر آرہے تھے۔کناٹ پیلس کی رونق تو شام کو ویسے ہی دیکھنے والی ہوتی ہے اور آج تو بات ہی اور تھی مگر

اپنی قسمت ایسی کہاں؟ ہمارے وقتوں میں 13 کے بعد 15 رفروری آجاتی تھی۔لڑکیاں اور معاشقے بھی اور طرح کے ہوتے تھے۔اب تو دنیا کے رنگ ڈھنگ ہی دوسرے ہیں۔ماضی کو یاد کر کے پتا نہیں بے چارگی کا احساس ہوتا یا افتخار کا بعض اوقات تو طے کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

گھر کی دہلیز پر قدم رکھنے سے پہلے راستے کی دھنک رنگ معدوم ہوتے نظر آئے۔عقب میں سورج نما بیوی جو کھڑی تھی۔یہاں سے دوسری ڈیوٹی کا آغاز ہوتا ہے۔یہاں تو دفتر سے بڑا حاکم موجود ہے جس کے اختیارات قید و بند سے آزاد ہوتے ہیں۔

ڈرائنگ روم میں زہیب بیٹھا ہوا نظر آیا۔مجھے تھوڑی حیرت ہوئی۔زہیب میری بیوی کا بھائی تھا۔اچانک اس طرح آنے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ میں نے تار و پود تلاش کرنے کی کوشش کی۔امرین نے بھی کوئی تذکرہ نہیں کیا تھا۔وہ ٹی وی آف کر کے میری طرف مخاطب ہوا ''السلام علیکم.....'' جواب دے کر میں پاس ہی بیٹھ گیا۔کب..... آئے؟

''دوپہر میں..... آیا..... تھا.....''۔

''اور گھر میں سب خیریت ہے؟''

''امی کی طبیعت کچھ گڑبڑ ہے''۔اسی وقت امرین آگئی۔

''آپ..... آ..... گئے۔'' وہی گھسا پٹا سوال۔''ہاں میں تو روز ہی آجاتا ہوں''۔جی میں آیا کہ کہہ بھی دوں مگر موقع کی نزاکت نہیں تھی۔

''امی کی طبیعت زیادہ خراب ہے۔زہیب مجھے لینے آیا ہے''۔امرین نے میرے تذبذب کو ختم کر دیا۔

''ارے..... یہ..... تو..... بری..... خبر ہے۔'' میں نے تأسف کا اظہار

www.urduchannel.in

کیا حالاں کہ ایک اچھی خبر بھی اس میں پوشیدہ تھی مگر اس پر یقین اتنا آسان تو نہیں۔ میرے ایسے نصیب کہاں کہ بیوی مجھے کچھ دنوں کے لیے چھوڑ کر چلی جائے۔ مجھے معلوم تھا سارا پروگرام اُس نے ترتیب دے لیا ہوگا جس کا اظہار موقع ملتے ہی کرے گی۔ کچھ بعید نہیں کہ زہیب کی آمد کی اطلاع اُسے پہلے سے ہو۔

کپڑے تبدیل کرنے کی غرض سے میں کمرے میں آیا۔ پیچھے جھم سے وہ بھی آدھمکی۔ ''آپ کو زحمت تو ہوگی مگر چوں کہ معاملہ ایسا ہے کہ جانا ضروری ہے''۔ کیا واقعی میرے خواب شرمندۂ تعبیر ہونے والے ہیں۔ اپنے آپ سے میں نے سوال کیا۔ پوری عیاری سے چہرے پر افسردگی طاری کر میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ایسے تاثرات قائم کیے جیسے دیکھ کر لگے کہ ''کیا واقعی تم یہ ستم ڈھا ہی دوگی''۔ ایک گہری سانس لے کر میں بولا ''تم میری پریشانی کی فکر مت کرو چند روز کی ہی تو بات ہے، میرے پاس چھٹیاں نہیں ہیں ورنہ تو میں ساتھ ہی چلتا''۔

''ہاں..... وہ تو..... میں..... سمجھ..... رہی ہوں۔''

''امی کی خبر سن کر مجھے بھی تشویش ہو رہی ہے''۔

''طارق کو فون کریں اگر کل کا Reservation مل جائے چاہے AC کا ہو۔ جتنی جلد ممکن ہو میں پہنچنا چاہتی ہوں''۔

''میں دیکھتا ہوں ابھی۔ تم چائے وائے تو پلاؤ''۔

''ارے ہاں..... میں تو بھول ہی گئی۔ آپ چینج کریں، میں چائے بناتی ہوں''۔ وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔

الٹے پاؤں گھبرائی ہوئی واپس آئی، ''کیا..... ہوا.....؟'' میں کرسی سے ٹکرا کر گرا ہوا تھا۔ اس نے سہارا دے کر اٹھایا، ''کیا ہو گیا..... گر کیسے گئے..... کہیں چوٹ

تو نہیں لگی؟'' ایک ساتھ اتنے سارے سوال۔ میں اب تک کھڑا ہو چکا تھا۔ اندر یا باہر کسی طرح کی چوٹ کا شبہ نہیں ہوا۔ وہ پھر گویا ہوئی، ''گر کیسے گئے؟''

تہمد میں پیر پھنس گیا تھا۔ میرے جواب پر وہ مسکرائی۔ ''آپ بھی..... بس۔''

میں اسے کس منہ سے بتاتا کہ تمہارے نکلتے ہی خوشی میں ایک جست لگائی تھی۔ مطمئن ہونے کے بعد کہ واقعی مجھے چوٹ نہیں لگی ہے وہ پھر سے چلی گئی۔ پوری طاقت بٹور کر میں نے..... یا..... ہو..... کہا مگر میری آواز مجھے بھی سنائی نہیں دی۔ آناً فاناً میں نے کپڑے تبدیل کیے۔ اس سے پہلے کہ پروگرام میں کسی تبدیلی کے امکان پیدا ہوں، میں ٹکٹ Confirm کروا دینا چاہتا تھا۔

طارق کو فون کر تفصیلات نوٹ کرائیں۔ اس نے بتایا ''ابھی Status دیکھ کر خبر دیتا ہوں۔ ویسے امید ہے کہ مل جائے گا''۔ آخری جملے سے تھوڑی راحت ملی۔ بچے بھی ٹیوشن سے فارغ ہو کر آ گئے تھے۔ میں نے فوری طور پر اُن کی خیر خبر لی۔ دوران گفتگو مجھ پر انکشاف ہوا کہ ننیہال جانے کی اطلاع انہیں مجھ سے پہلے سے تھی۔ میں فی الحال اس مرحلے میں تھا کہ مثبت یا منفی کسی طرح کے ردعمل کا اظہار نہ کروں۔ میرے خوش ہونے کی بھنک بھی بیگم کو مل گئی تو لتے لے ڈالے گی۔ کسی طرح کا منفی پہلو پیش کرنے میں یہ خوف لاحق تھا کہ جانے کتنے بری لگ جائے۔ ممکن ہے میڈیم جانے کا ارادہ ہی ترک کر دیں۔ گھریلو عورتیں تقریباً ایک جیسی ہوتی ہیں۔

دس منٹ بعد ہی طارق کا فون آ گیا۔ اس نے ٹکٹ Confirm ہو جانے کی اطلاع دی۔ میرے اندر انار چھوٹنے لگے۔ افسردگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے میں نے امرین کو صورت حال سے آگاہ کر دیا۔ اس کے تاروں میں ایک دم سے جیسے کرنٹ آ گیا ہو۔ چائے میز پر رکھ کر بولی کہ میں اس وقت بیٹھ نہیں پاؤں گی..... بہت کام ہے، سب

www.urduchannel.in

سمیٹنا ہے اور packing بھی کرنی ہے''۔

''تم چلو..... میں بھی آرہا ہوں تمہارا ہاتھ بٹانے''۔ کہہ کر میں نے چائے کی پیالی اٹھائی تب تک وہ غائب ہو چکی تھی۔

سارے کام سمیٹنے میں بارہ بج گئے۔ کرسی پر بیٹھا میں صرف تماشائی بنا ہوا تھا۔ کچھ وقفے سے چھوٹے موٹے کام مجھے بھی سونپ دیتی۔ سنیے ذرا یہ پانی کی بوتل کھنگال دیجیے اور ابھی پانی نہیں بھریئے گا۔ یہ بسکٹ اور چپس کا پیکٹ میرے پرس میں ڈال دیں مگر پیسے نہیں گنیے گا، بیسن پر میری hair clip پڑی ہے، پلیز اٹھا دیں..... وغیرہ وغیرہ۔ حکم حاکم مرگ مفاجات۔ میں سعادت مندی سے بھاگ بھاگ کر کام کرتا رہا۔ ساڑھے بارہ بجے مجھے خبر ملی کہ سب نمٹ گیا۔ اب کچھ یاد آئے گا تو صبح دیکھا جائے گا۔ کافی دیر ہوگئی ہے صبح جلدی اٹھنا بھی ہے۔ بستر پر پھیلے ہوئے کپڑے سمیٹتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوئی۔ ''آپ لیٹیے کافی تھک گئے ہوں گے۔ میں بدن پر پانی ڈال کر ابھی آتی ہوں۔ صبح نہانے کا وقت نہیں ملے گا''۔ نائٹی سنبھال کر وہ باہر چلی گئی۔ چادر کی شکنیں درست کر میں سیدھا ہو گیا۔ بچوں کو سوتے ہوئے دیر ہو چکی تھی۔ میری آنکھوں پر بھی نیند کا غلبہ طاری ہونے لگا تھا۔ اٹھ کر لائٹ آف کی اور نائٹ بلب جلایا اور پھر سے لڑھک گیا۔

مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی تھی کہ تبھی چہرے پر پانی کی بوندوں سے میں ہڑبڑا گیا۔ امرین میرے اوپر جھکی ہوئی تھی۔ اس کے کھلے ہوئے بال جو شیمپو سے مہک رہے تھے مجھے زعفرانی فضاؤں کی سیر کرانے لگے۔ ''آج بھی اتنی جلدی ہے سونے کی''۔ عجیب انداز میں اس نے کہا ورنہ چند سالوں کے بعد بیشتر بیویاں تو یہ روش اختیار ہی نہیں کرتیں اور اگر کر بھی لیں تو اس کا اثر اس طرح کہاں ہوتا ہے۔ ہم مشرق والوں کو تو شہوت کے معنیٰ ہی نہیں معلوم۔ تھکی ماندی جورو کو رات کے کسی پہر اپنی طرف گھسیٹ لیا یا خود ادھر کھسک گئے

۔ آنکھ کھولے بغیر شلوار کھولی یا نائٹی پیٹی کوٹ اٹھایا، انگلیوں اور دوسرے اعضا نے خود اپنی راہیں تلاش کیں اور اندھیرے میں کہیں معدوم ہو گئے، نہ کہیں جگنو چمکے..... نہ کہکشاں بکھری..... دس پانچ منٹ میں سب ٹائیں ٹائیں فش۔ کروٹ بدلی خراٹے شروع۔ آٹھ نو مہینے بعد گھر میں نئی کلکاریاں۔

اس وقت امرین کا رویہ روایت سے انحراف تھا۔ اس لیے میرا چوکنا لازمی تھا۔ ''کیوں..... آج..... کوئی خاص بات..... ہے..... کیا؟'' میں نے اس کی آنکھوں کے اندر جھانکا۔ ''نہیں..... ہے'' ادائے ناز سے اس نے کہا۔ ''یہ ناز و شوخی تمہیں آتی تھیں تو اب تک کہاں چھپائے رکھیں''۔ جی میں آیا کہ کہہ بھی دوں، پر ٹال گیا۔ وہ برابر میں لیٹ گئی۔ داہنہ ہاتھ گردن کے نیچے حائل کیا اور بائیں سے میرے سینے کے بالوں سے کھیلنے لگی۔ مرد کے سینے کے بال عورت کے لیے عام لمحوں میں بھی خاص ہوتے ہیں۔ اتنی دنیاداری تو مجھے بھی معلوم تھی۔ موجیں چٹانوں کا سکوت توڑ رہی تھیں۔ چند ثانیوں میں ہی پتھر میں دراڑیں پڑ گئیں اور اچھلتا ہوا پانی اندر تک پہنچ گیا۔

اَلارم کی تیز گھنٹی سے میری آنکھ کھلی۔ حالاں کہ امرین نے فوراً اسے بند کر دیا۔ ''آپ ابھی لیٹے رہئے''۔ کہہ کر وہ اٹھ گئی۔ ہاتھ پکڑ کر میں نے اسے گھسیٹنے کی کوشش کی مگر وہ پھسل گئی۔ ''اں..... ہوں..... اب..... نہیں۔ بالوں کو سمیٹ کر ربر بینڈ باندھا اور باہر نکل گئی۔ میں نے پٹ لیٹ کر آنکھیں موند لیں کہ شاید اس طرح سرکش جذبے دب دبا جائیں۔ میں نے بستر چھوڑا تب تک امرین تقریباً ساری تیاریاں کر چکی تھی۔ گاڑی کا وقت بھی قریب آرہا تھا۔ میرے لیے ضروری ہدایات بھی جاری ہونے والی تھیں۔ سلنڈر کا ناب کس طرف سے آن ہوتا ہے۔ ٹی وی مین سوئچ سے آف کیجئے گا۔ الٹی سیدھی چیزیں مت کھائیے گا۔ باہر جاتے وقت تالے ٹھیک سے چیک ضرور کر لیں، وغیرہ

وغیرہ۔حسب توقع اس نے وہی ساری باتیں مجھے سمجھا دیں، ساتھ میں یہ بھی کہ شکر اور چائے پتی کے ڈبے میں نے باہر ہی رکھ دیے ہیں، کھلے نہ چھوڑ دیے گا۔علاوہ ازیں کچھ مشورے اور تنبیہ کی گئیں۔گھڑی کی سوئیوں کے ساتھ تمام مرحلے آگے بڑھ رہے تھے۔

خدا خدا کر کے گاڑی چھوٹنے کا وقت بھی آ گیا۔بچوں کو پیار کیا، بیوی کو صرف اس نظر سے دیکھا وہ بھی زیر لب مسکرا رہی تھی۔مگر یہ تبسم عارضی تھا۔اندر کہیں بچھڑنے کا درد بھی چھپائے تھی۔''خدا حافظ ......اپنا خیال رکھیے گا......اور روز فون کیجیے گا''۔یہ آخری جملے تھے۔اس کے بعد ٹرین رینگتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔چند ثانیوں میں آنکھوں سے اوجھل ہوگئی مگر وہیں سے ایک شوہر کی آزادی کا سورج طلوع ہوا۔میں کسی فاتح کی طرح لوٹ رہا تھا۔

گاڑی اسٹارٹ کرنے سے پہلے خیال آیا کہ آج آفس گول کر جاؤں لیکن جاؤں گا کہاں؟ اس سوال کا جواب میرے پاس نہیں تھا۔ابھی تو کئی دن میری دسترس میں ہیں، شام کو دوستوں سے گفتگو کے بعد آگے کے پروگرام ترتیب دوں گا۔

دفتر کے سات گھنٹے کیسے گزرے پتا ہی نہیں چلا۔اتنے کام کے باوجود کوئی خاص بات نہیں محسوس ہوئی۔نہ تھکاوٹ کا احساس نہ بوجھل ہونے کا شائبہ بلکہ کئی لوگوں نے ٹوکا بھی''کیا بات ہے بھائی آج کچھ زیادہ ہی خوش لگ رہے ہیں''۔

گھر میں داخل ہوا تو ایک جھٹکا سا لگا۔یہ پہلا اتفاق تھا جب میرا انتظار کرنے والا کوئی نہیں تھا۔اس سے پہلے کہ یہ احساسات مجھے اپنی گرفت میں لیتے، میں نے ان خیالوں سے رہائی حاصل کر لی۔دروازہ اندر سے بند کر کے کرسی پر بیٹھنے سے پہلے ٹی وی آن کیا۔ایک ہاتھ میں رموٹ، دوسرے سے جوتے موزے اتارے پھر پینٹ، شرٹ۔انگریزی چینل پر ہمارے یہاں کا گانا چل رہا تھا۔یہ نغمہ تمام پائدانوں پر اول نمبر تھا۔مجھے بھی بہت پسند تھا۔امرین کی موجودگی میں اکثر آواز بند کر کے دیکھا کرتا۔گانے کی اس درجہ مقبولیت کی وجہ چست جینزوں کے پیچھے ناف سے بہت نیچے کا وہ حصہ جسے انگریزی میں کیوٹریس کہتے ہیں، اس مقام پر رنگ موتی جڑی پینٹی کا نظر آنا ساتھ میں فحش اور بے ہودگی سے آگے کی حرکات وسکنات پیش کرتیں قیامت خیز لڑکیاں جب میرے جیسے سنجیدہ لوگ اس کے سحر سے نہیں بچ پائے تو نئی عمر کے ناپختہ اور ناتجربہ کاروں پر کیا گزرتی ہوگی۔

ٹی وی کا Volume بڑھا کر میں باہر آیا۔بیسن پر جا کر منہ دھویا۔سوچا ایک کپ چائے پی جائے۔باورچی خانے میں گھسا، ناپ کر ایک کپ پانی چڑھایا، سلنڈر کا ناب آن کر کے لائٹر سے چولہا جلانے کی کوشش کی لیکن وہ نہیں جلا۔ایک لمحہ کو تو مجھے حیرت ہوئی۔گیس ختم ہونے کا تو سوال ہی نہیں اٹھتا۔ابھی چار دن پہلے تو آئی ہے۔میں نے غیر ارادی طور پر ناب کا رخ دوسری طرف کیا پھر سے جلانے کی کوشش کی۔بھم سے آگ نکل پڑی۔sim کر کے راحت کی سانس لی کہ ایک مرحلہ تو طے ہوا۔بہر حال کسی طرح چائے گھولی۔کپ میں انڈیلا تو آدھی پیالی سے کچھ زیادہ تھی جب کہ خاصہ دودھ ڈالا تھا۔مجھے قطعی نہیں معلوم تھا کہ کتنی دیر میں کتنا پانی بھاپ بن کر اڑتا ہے۔ہر چند کہ چائے کی مقدار میرے لیے ناکافی تھی، پر دوبارہ سے یہ کوشش رائیگاں کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔کپ سنبھال کر میں واپس کمرے میں آ گیا۔

شام سے رات ہوئی......رات سے صبح......

صبح آنکھ معمول کے برخلاف بہت دیر سے کھلی۔رات دیر سے سویا بھی تو تھا۔ٹی وی دیکھتے کب نیند آ گئی معلوم ہی نہ پڑا۔صبح پیشاب کرنے نہ اٹھا ہوتا تو ٹی وی اب تک چل رہا ہوتا۔صبح ایک بار آنکھ اس وقت کھلی جب ٹیرس پر اخبار گرا تھا۔یعنی آج خود ہی اٹھ کر جانا پڑے گا۔کوشش کے باوجود ہمت نہیں کر پایا اور پھر سے آنکھیں موند لیں۔

www.urduchannel.in

خاصی دیر بعد نیم وا آنکھوں سے گھڑی دیکھی تو نو بج رہے تھے۔ میں بالکل اچھل پڑا۔ اسی وقت فون کی گھنٹی بجی۔ لپک کر رسیو اٹھایا۔ ادھر امرین تھی۔ اس نے خیریت سے گھر پہنچنے کی اطلاع دی۔ میں نے والدہ کی طبیعت دریافت کی۔ جواب دے کر وہ میری باز پرس کرنے لگی۔ کتنے بجے سوئے تھے، اٹھے کس وقت، ناشتہ کیا یا نہیں اور بھی جانے کیا کیا، ہر بات کا اطمینان بخش جواب دے کر چین کی سانس لی کہ چلو پاس ہونے کے نمبر تو مل ہی جائیں گے۔

فون رکھنے کے بعد میں غسل خانے کی طرف بھاگا۔ کافی دیر ہو چکی تھی۔ بھاگم بھاگ میں ایک پیالی چائے تک نصیب نہیں ہوئی۔ تیار ہو کر نکلا۔ ایک ریستراں میں ناشتہ کیا اور دفتر کے لیے گاڑی دوڑا دی۔

وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ نصف گھنٹہ تاخیر سے پہنچا۔ معلوم ہوا کمشنر صاحب تشریف لائے ہیں۔ حاضری رجسٹر بھی اندر ہے۔ یہ سب بھی آج ہی ہونا تھا۔ مجھے یاد نہیں تھا کہ میں دفتر کبھی دیر سے آیا ہوں۔ اب تو جو بھد پٹنی ہوگی پٹ ہی کر رہے گی۔ بھاگنا میرا شیوہ نہیں۔ خیر سے آدھے گھنٹے بعد کمشنر چلے گئے۔ شاید مطلوبہ چیزیں انہیں فراہم کرا دی گئی تھیں۔

دوسرا دن پہلے کے مقابلے گھر میں کچھ زیادہ تکلیف دہ گزرا۔ آج تو چائے بنانے کا بھی موڈ نہیں ہوا گو کہ شدت سے طلب ہو رہی تھی۔ اب ایک چائے کے لیے باہر جانے کا اہتمام کروں۔ اس کے لیے خود کو تیار نہیں کر پایا۔ پھر سوچا جب کھانا کھانے نکلوں گا تب ہی چائے بھی زہر مار کروں گا۔

وقت کاٹنے کے لیے ٹی وی میرا بہترین سہارا ہے۔ ایک سے پچاس تک چینل کئی بار بدل کر دیکھے پھر بھی ٹی وی بند کر دیا۔ اب کیا کیا جائے۔ کمرے کی ساری چیزوں پر ایک

طائرانہ سی نظر ڈالی۔ فون پر نگاہ ٹھہر گئی۔ اٹھا کر نمبر گھمانے شروع کیے۔ تھوڑی دیر میں اس سے بھی فراغت مل گئی۔ بستر بھی الٹا پلٹا پڑا تھا۔ کیسا صاف ستھرا گھر رہا کرتا تھا لیکن دو روز میں ہی کتے لوٹنے لگے تھے۔ بیوی سے آئے دن تکرار اور جھائیں جھائیں جو ذہنی انتشار کا باعث بنتی تھی، جن لمحوں سے میں نجات کی دعائیں مانگا کرتا تھا، جگر گوشوں سے ان ساعتوں کی طلب اٹھ رہی تھی۔ نہ کوئی خوشی میں شریک ہونے والا تھا اور نہ شاخسانے میں۔ بالآخر میں دو دن میں اکتا گیا۔

دو روز بعد اتوار تھا۔ ہار کر دوستوں سے اتوار کو باہر نکلنے کا پروگرام طے کیا لیکن یہ وقت کیسے کٹے گا۔ غزل کی سی ڈی لگا کر بستر پر لڑھک گیا۔ چھت پر پنکھا تیزی سے گھوم رہا تھا۔ اس سے بھی تیز میری وحشت۔ اچانک بستر سے ایک مہک اٹھی۔ مجھے ذرا بھی شواری نہیں ہوئی یہ سمجھنے میں کہ یہ کس کی خوشبو ہے۔ امرین کا تکیہ میں نے اپنے قریب کیا تو مجھے لگا جیسے میں نے خود اسے قریب گھسیٹ لیا ہو۔ چادر تکیہ میں گھر والی کی اتنی خوشبو رچی بسی ہوتی ہے اس کا اندازہ آج سے پہلے کیوں نہیں ہوا۔ یہ مہک میرے لیے خاصی مشکلات پیدا کرنے لگیں۔ میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ فوراً امرین کو فون ملایا۔ وہ میرے فون کی منتظر تھی۔ میں نے بتایا کہ بچے بہت یاد آ رہے ہیں۔ اس نے کہا کہ بچے بھی آپ کو بہت مس کر رہے ہیں۔

''یاد تو میں بھی بہت کر رہا ہوں، بچوں کو بھی اور بچوں کی ماں کو بھی''۔ وہ ہنسنے لگی ''ابھی دن ہی کتنے ہوئے ہیں؟'' کچھ رسمی باتوں کے بعد فون رکھ دیا۔ ایک گونہ راحت محسوس ہوئی۔ اب بھوک بھی لگنے لگی تھی۔ میں باہر جانے کی تیاری کرنے لگا۔

چار دنوں بعد گھر اجاڑ و ویران نظر آنے لگا۔ فرش کے علاوہ تمام چیزوں پر گرد کی تہیں نظر آنے لگیں تھیں۔ اتنی گندگی میں رہنے کا میں عادی نہیں تھا اور پورے کمرے کی جھاڑ پونچھ میرے حوصلوں سے باہر تھی۔ اسی کے ساتھ امرین کی کمی کا باقاعدہ احساس ہوا۔ بچوں

www.urduchannel.in

کی یاد بھی بے طرح ستا رہی تھی۔

اتوار کا سارا دن دوستوں کے ساتھ گزرا۔ بیوی گھر میں میرے انتظار میں نہیں بیٹھی تھی مگر جانے کتنی بار گھر یاد آیا۔ امرین کی عدم موجودگی کے باعث میں جس آزادی کا تصور کیا کرتا تھا یا جس کے بارے میں سوچ کر ہی ایک thrill پیدا ہوتا تھا وہ سب جانے کہاں مفقود ہو گیا تھا۔ زندگی میں پہلی بار امرین اتنے دنوں کے لیے مجھ سے الگ ہوئی تھی۔ اب احساس ہوتا ہے کہ وہ تو میری بیساکھی ہے یا شاید اس سے بھی زیادہ۔ اس کے بغیر ایک گلاس پانی کے لیے مجھے سوچنا پڑتا ہے۔ نہیں میں اب اور نہیں رہ سکتا۔ مجھے فوراً اسے بلا لینا چاہیے۔ پانچ دنوں میں ہوٹل کے کھانے سے بھی تنگ آ گیا تھا۔ بازار میں کھانا بہت عمدہ ملتا ہے مگر آلو کے پراٹھے کہیں نصیب نہیں تھے۔ کڑھی کھانے کا بہت دل چاہ رہا تھا، وہ بھی ممکن نہیں۔ آخر کار میں نے فون گھما ہی دیا۔ یہ جان کر کہ ساسو کی طبیعت اب ٹھیک ہے، میں نے اطمینان کی سانس لی۔ بعد ازاں اپنا دکھڑا بیان کر دیا۔ وہ خود بھی پریشان ہوئی۔ اس نے کہا میں دو ایک روز میں ہی آتی ہوں‘‘۔ یہ خبر ملنے کے بعد خود کو ہلکا محسوس کیا۔ ایک دو روز تو انتظار کے سحر میں ہی گزر جائیں گے۔

اگلے روز میں آفس کے لیے نکل ہی رہا تھا تبھی امرین کا فون آ گیا۔ اس نے اطلاع دینے کے لیے فون کیا تھا کہ وہ کل شام کو پہنچ رہی ہے۔ جواب میں، میں حماقت آمیز باتیں کہیں کہ اگر اس کا موڈ ہو تو وہ کچھ دن اور رُک جائے، اتنی جلدی آنے سے وہاں کسی کو اعتراض نہ ہو اور امی کو اگر تمہاری ضرورت...... ہو...... تو۔

’’امی تو...... آپ کے فون سے پہلے سے کہہ رہی تھیں کہ انھیں دقت ہو رہی ہوگی...... تم چلی جاؤ۔‘‘

’’تو پھر ٹھیک ہے میں کل اسٹیشن پہنچتا ہوں۔ سب کو سلام کہہ دینا‘‘۔ شام کو دفتر

سے آنے کے بعد میں نے گھر کی صفائی کی۔ ایک ایک چیز کو چمکا دیا۔ کلاک اور کلینڈر تک کی گرد صاف کر دی۔ گلدانوں کے پھول پاؤڈر سے دھوئے اور یہ سب کچھ کتنی لگن سے کیا۔ اپنے رویے پر مجھے خود حیرت تھی۔ امرین ہوتی تو آج کتنا خوش ہوتی۔

بیوی بچوں کے آتے ہی در و بام کی نحوست غائب ہو گئی۔ مکان اور گھر کے درمیان عورت ہی حائل ہوتی ہے۔ مرد اس میں کچھ بنا بگاڑ نہیں سکتا۔

رات کو بستر میں جانے سے پہلے میں نہا کر آیا تھا۔ وہ لیٹی ہوئی تھی۔ داہنا ہاتھ موڑ کر آنکھوں پر رکھے ہوئے تھی۔ میری آہٹ پر اس نے ہاتھ ہٹا کر مجھے دیکھا، تب تک میں اس کے برابر میں لیٹ چکا تھا۔ ایک ہاتھ سے اسے اپنی طرف گھمایا، اس کی دونوں آنکھیں کھل چکی تھیں، مجھے بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔

’’آج بھی...... اتنی...... جلدی...... ہے...... سونے کی......‘‘

’’کیوں ...... آج ...... کوئی ...... خاص ...... بات ...... ہے ...... کیا؟‘‘ بالکل میرے ہی انداز میں اس نے کہا تھا۔

’’نہیں...... ہے......‘‘ میں نے اس کا لہجہ اختیار کر لیا۔ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اور سفر کی تکان کے باوجود دونوں ہاتھ میری گردن میں ڈال کر مجھے اپنی طرف گھسیٹ لیا۔

(سہ ماہی ’مباحثہ‘ پٹنہ۔ جنوری تا مارچ 2005ء۔ شمارہ نمبر 19)

❁❁❁

www.urduchannel.in

تجویز

دیوار کی طرف میری نظر بالکل غیر ارادی طور پر اٹھی تھی مگر جب گھڑی کی سوئیوں کو بارہ بجانے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھا تو میں نے ارادہ کر لیا کہ اب مجھے سو جانا چاہیے ۔کتاب کا ورق کنارے پر تھوڑا سا موڑ کر کارنر ریکس پر رکھ دی اور سیدھے ہو کر لیٹ گیا۔ کچھ دیر بعد میں نے محسوس کیا کہ نیند کی پریاں میری آنکھوں کی زمین پر بہت آہستگی سے پر پھیلا رہی ہیں ۔سونے سے قبل مجھے ٹیوب لائٹ بھی آف کرنی تھی مگر اس وقت سوئچ بورڈ تک جانا مجھے بہت ناگوار لگ رہا تھا۔ ہر چند کہ میرے پاس نائٹ لیمپ تھا لیکن کل وہ جلتے ہوئے آپ ہی آپ بجھ گیا۔ اٹھنے سے پہلے میں نے فیصلہ کر لیا کہ صبح سب سے پہلا کام لیمپ کو درست کرانا ہی ہوگا۔

میں اٹھنے ہی والا تھا کہ کلاک اور ٹیوب لائٹ کے وسط کی خالی دیوار پر ایک بھورے رنگ کی چھپکلی سختی سے اپنے پنجے گڑائے ہوئے نظر آئی۔شبہ ہوا کہ وہ مجھے ہی گھور رہی ہے مگر جب میں نے اسے غور سے دیکھا تو مجھے یقین کرنا پڑا کہ وہ مجھے ہی گھور رہی تھی۔اس کی چھوٹی چھوٹی سپاٹ آنکھیں مجھے خوف زدہ کر گئیں ۔جسم میں جھرجھری سی دوڑ گئی۔ جب کہ مجھے معلوم تھا کہ میں اپنے گھر میں محفوظ ہوں۔مگر کون کہاں محفوظ ہے؟ اور لوگ یہ بھی

تو کہتے ہیں کہ کبھی کبھی آنکھوں دیکھا اور کانوں سنا بھی غلط ہوتا ہے۔اس خیال کے ساتھ خوف میں مزید اضافہ ہوا۔ میں حیرت زدہ تھا کہ جو چیز اب تک کراہیت پیدا کرتی تھی اس سے خوف کے کیا معنی؟ کھڑکی دروازے بھی بند تھے لیکن خوف و ہراس کے قطرے ٹپ ٹپ کی طرح میرے ذہن پر گر رہے تھے۔ جی میں آیا کہ پاس سوتی ہوئی بیوی کو اٹھا دوں مگر فوراً ہی خیال ترک کرنا پڑا۔ میں جانتا تھا کہ یہ جاگ کر بھی کیا کر لے گی۔ چھپکلی کا نام سنتے ہی حقارت سے بہت برا منہ بنائے گی۔ ویسے بھی جتنا اچھا ہے مجھے خوب معلوم ہے۔ جب آنکھ کے اشارے سے مسلسل اپنی طرف گھورتی ہوئی چھپکلی اسے دکھاؤں گا تو ایک زور کی چیخ مار کر وہ میرے سینے سے لپٹ جائے گی یا میری بانہوں میں اسے عدم تحفظ کا احساس ہوا تو لحاف میں گھس کر شور مچانا شروع کر دے گی۔ ممکن ہے اس کی آواز سن کر پاس پڑوس کے لوگ بھی اٹھ جائیں اور جب انہیں یہ معلوم ہو کہ میں جو دن رات اس قدر خوفناک کہانیاں لکھتا ہوں، ایک چھپکلی سے ڈر گیا ہوں۔ بات آئینہ کی طرح صاف تھی لیکن مجھے اس وقت اپنے اندر بیٹھے اس کہانی کار پر بڑا ترس آ رہا تھا۔

کچھ وقت گزر جانے کے بعد میں نے ایک بار پھر اس سے آنکھ ملانے کی ہمت کی ۔وہ اب بھی مجھے ہی دیکھے جا رہی تھی بلکہ اس بار مجھے لگا کہ جیسے وہ کچھ کہنا چاہ رہی ہو۔ بار بار اس کا کھلتا اور بند ہوتا ہوا منہ کچھ کہنے کو بے قرار ہو۔ میں ذہن سے یہ تمام فرسودہ خیالات نکال دینا چاہتا تھا مگر تخیلات تو کسی صنف کی روح کا حصہ ہوتے ہیں اور اس سے علیٰحدگی کیسے ممکن ہے؟

''تو.....اب.....کیا.....کیا جائے؟ میں نے خود ہی سے سوال کیا اور خود سے کیے گئے سوالوں کے جواب بھی خود ہی دینے ہوتے ہیں لیکن میرے پاس تو صرف سوال تھے۔سوائے اس کے کہ میں اٹھ کر لائٹ آف کر دوں اور خاموشی سے لحاف اوڑھ کر

www.urduchannel.in

اس عورت کی طرح ہر بات سے بے خبر ہو کر سو جاؤں کیوں کہ میں جب تک جاگتا رہوں گا، اس طرح کے اوٹ پٹانگ خیالوں سے نجات نہیں ملے گی اور پھر میں نے وہی کیا۔ لائٹ بند کر کے لحاف میں گھس گیا۔ آنکھیں بھی بند کر لیں، جھینگروں کی آواز اب اور تیز سنائی دے رہی تھی۔ دور کہیں بلی کے رونے کی آواز سے ماحول اور بھی خوفناک ہو گیا تھا۔ نیند کا کہیں دور دور تک پتا نہیں تھا۔ چاہتے ہوئے بھی میں لحاف نہیں ہٹا پا رہا تھا۔ حالاں کہ مجھے بہت گرمی لگ رہی تھی مگر مجھے یہ شبہ بھی تھا کہ بلی کہیں دور نہیں میرے سرہانے اس انتظار میں بیٹھی تھی کہ میں لحاف ہٹاؤں اور وہ مجھ پر جھپٹ پڑے اسی ادھیڑ بن میں پانچ ساتھ منٹ اور گزر گئے۔ خواہش ہوئی کہ لائٹ جلا کر دیکھوں کہ چھپکلی ہے یا چلی گئی۔ میں غور و خوض کر ہی رہا تھا کہ چرچ میں بارہ بجے کے گھنٹے بجنے شروع ہوئے۔ عام طور سے رات میں پڑھتے ہوئے ان گھنٹوں کے بجنے کا مجھے انتظار رہتا تھا۔ سامنے دیوار پر گھڑی ٹنگی ہوئی تھی لیکن جب سے بازار میں الیکٹرانک گھڑیوں کی آمد ہوئی، پنڈولم ہماری ختم ہوتی اقدار کی طرح کبھی کبھی ہی دکھائی دیتی ہے۔ میں مطالعہ میں اس قدر منہمک ہو جاتا ہوں کہ پھر کتاب سے اور ذہن ہٹانے کو دل نہیں کرتا اور اکثر چرچ کے گھنٹے ہی میرے انہماک اور تسلسل کو مجروح کرتے ہیں مگر آج ان گھنٹوں کی صدا سے ایک الگ ہی تاثر پڑا تھا۔ وجہ شاید میں خود بھی سمجھ پا رہا تھا۔

گھنٹے بج کر خاموش ہو چکے تھے لیکن ان کی بازگشت اب بھی میرے کانوں کے آس پاس گونج رہی تھی۔ کچھ ہی لمحوں کے لیے میں چھپکلی سے جاری اپنی آنکھ مچولی بھول کر بجتے ہوئے ناقوس کی آواز میں گم ہو گیا، مگر اس کے بند ہوتے ہی میں تذبذب اور خوف کی اس گہری کھائی میں جا گرا جہاں سے نکلنے کے لیے میں نبرد آزما تھا۔ جب مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو تجسس کے ساتھ لحاف ہٹا کر اٹھ بیٹھا۔ دوبارہ سوئچ پر انگلی رکھی تو ٹیوب لائٹ

روشن ہو گئی۔ میں نے دیکھا دیوار پر آدھا درجن چھپکلیاں موجود تھیں۔ بھوری، کالی، چتکبری رنگوں کی۔ بس میری چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ سب ایک قطار میں دیوار سے اس طرح چپکی تھیں جیسے دوڑ کے کسی مقابلہ میں شامل ہونے کے لیے آئی ہوں۔ بس ریفری کی سیٹی بجنے بھر کا انتظار ہو۔

یا.....اللہ.....ماجرا.....کیا ہے؟ میں بدبدایا بھی۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اس طرح کا کوئی واقعہ درپیش بھی نہیں آیا تھا۔ میری آنکھیں تو پہلی بار یہ پراسرار منظر دیکھ رہی تھیں۔ چند لمحوں کے بعد میں نے نگاہ ایک بار پھر دیوار کی طرف مرکوز کی۔ وہ سب اپنے سر ایک ساتھ اوپر نیچے کر رہی تھیں۔ اب مزید کچھ دیکھنا میرے لیے بہت مشکل ہو رہا تھا۔ لپک کر میں نے لائٹ آف کر دی اور اس طرح چلتا ہوا جیسے کوئی چور چوری کے ارادے سے کسی گھر میں داخل ہوتا ہے، میں چھت پر نکل آیا۔ یہاں بہت شدید سردی تھی مگر میری رگوں میں تو جیسے شرارے ابل رہے تھے۔ ٹھنڈ کا احساس تک نہیں ہوا۔ جلدی میں سگریٹ بھی میں نیچے بھول آیا تھا۔ دوبارہ نیچے جا کر سگریٹ لانے کو بھی ذہن آمادہ نہیں ہوا حالاں کہ اس وقت سگریٹ کی مجھے سخت ضرورت تھی پر میں نے جان خطرے میں ڈالنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ رات کسی نئی نویلی دلہن کی طرح لجائی، شرمائی سی نظر آ رہی تھی۔ جبین پر چاند ستارے مزین تھے۔ چھت پر آ کر مجھے محسوس ہوا جیسے جھینگروں کی آواز ستاروں کے ارتعاش سے پیدا ہو رہی ہے۔ تھوڑی دیر بعد رگوں میں بھڑکتے شعلوں سے سرد ہونے لگے۔ ہوا کے یخ بستہ جھونکے مجھ میں سرایت کرنے لگے۔ میں نے بالوں میں ہاتھ پھیرا تو شبنم کے بے شمار قطرے میری مٹھی میں قید ہو گئے۔ میں شاید اس کے بعد بھی ٹہلتا رہتا اگر بیوی کے جاگنے کی آہٹ نہ سنائی دی ہوتی۔ اس نے تیز آواز میں مجھے پکارا اور نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے زینے کا رخ کرنا پڑا۔ کمرے میں آ کر میں نے اسے لائٹ آن نہ کرنے کا حکم دیا۔ اس نے

www.urduchannel.in

وجہ دریافت کی۔ میں بات صبح پر ٹال دی اور آگے مزید گفتگو کے لیے بھی اسے منع کر دیا۔ یقیناً اسے میری بات بری لگی ہوگی مگر اس وقت میں ان باتوں میں الجھنا نہیں چاہتا تھا۔ میری ساری توجہ چھپکلیوں کی طرف تھی اور میں انہیں کے متعلق سوچنے پر مجبور تھا۔ میں چاہ کر بھی اس وقت روٹھی ہوئی بیوی کو نہیں منا سکتا تھا۔ ملگجی روشنی میں کھلی اور یخ بستہ آنکھوں سے وہ منظر دیکھنے کو مجبور تھا۔ بیوی کے خراٹوں نے اچانک میرا ذہن اپنی طرف کھینچا۔ میں نے اس کی جانب کروٹ کر لی اور جاگتی آنکھوں سے سوتی ہوئی بیگم کو نہارنے لگا۔ سوتے میں عورت کا حسن واقعی جادو جگاتا ہے۔ خواہ وہ عورت اپنی بیوی ہی کیوں نہ ہو؟ اس کے سینے پر سانسوں کے زیر و بم دیکھتے ہوئے مجھے کب نیند آ گئی۔ میں نہیں جان سکا۔

چھپکلیوں کی ایک بین الاقوامی کانفرنس گوہ کی صدارت میں منعقد ہو رہی تھی۔ اس میں دنیا کے تمام ممالک کی چھپکلیوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ سب کی جبیں پر ایک سوالیہ نشان تھا اور اسی نشان نے ان کی راتوں کی نیندیں اور دن کا سکون چھین رکھا تھا۔ سب کو بس یہی فکر تھی کہ کسی طرح پیشانی سے ذلالت کا یہ نشان مٹ جائے۔ یہ اجتماع انہیں مسائل اور افتاد سے بچنے کے راستہ تلاش کرنے پر مبنی تھا۔

سب سے زیادہ اضطراب و بے چینی ہندوستان کے خیموں میں نظر آ رہی تھی۔ کچھ رسومات کے بعد کانفرنس کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ اس سے قبل کہ مغرب کی کوئی سفید یا چتکبری چھپکلی کھڑی ہو، ہندوستان کی ایک سیاہ فام چھپکلی کو نام لے کر اپنا مسئلہ بیان کرنے کی درخواست کی گئی۔ اس نے پہلے اپنے آس پاس کا بغور جائزہ لیا پھر سنجیدگی اور متانت کے ساتھ بولنا شروع کیا۔ ''دوستو! ہمارا یہاں جمع ہونے کا مقصد کوئی پکنک یا سیر سپاٹا ہرگز نہیں اور نہ ہی یہ سوال ہے کہ عہد پارینہ میں ہم جنگلوں میں مقیم تھے، جنگل بدر ..... کیوں .... ہوئے؟ ہمارے مسائل کا آغاز تو بہت بعد میں ہوتا ہے۔ جنگلات سے نکل کر ہم نے شہروں

کا رخ کیا۔ بنی نوع آدم کے ساتھ ایک ہی چھت کے نیچے سال دو سال نہیں صدیاں گزاریں۔ یہ جان لینے کے بعد بھی کہ ہم میں زہر ہے، اس نے ہمیں کبھی نقصان نہیں پہنچایا۔ مجموعی طور پر ہمیں کبھی شکایت کا موقع نہیں ملا، مگر ادھر کچھ عرصے سے یہ ہمیں مارنے لگا ہے۔ ہمارے زہر کا جو خوف کبھی اس میں تھا، وہ قصے، کہانیوں کی بات ہو چکی ہے۔ ہم کو حیرت ہمارے قتل پر اتنی نہیں جتنی اس کے طریقۂ کار پر ہے۔ چند لمحوں کے لیے وہاں سکوت طاری ہو جاتا ہے۔ پھر چھپکلیاں آپس میں کھسر پھسر شروع کر دیتی ہیں۔ وہ اپنی گفتگو آگے شروع کرتی ہے۔

''ہمیں جلا کر ہماری راکھ سگریٹ میں بھر کر پینے لگا ہے۔ کچھ لوگوں نے تو اسے اپنا روزگار بھی بنا لیا ہے۔ ہمارا اور ہماری طرح کے دیگر جانوروں کا زہر اس میں سرایت کر چکا ہے، شاید یہی وجہ ہے کہ اس...نے.....ایسے بم بنا لیے جو ماں کے بطنوں میں پل رہے بچوں تک .....کا خون پی گئے۔ یہ ہمارا موضوع نہیں ہے۔ لیکن زہرہ اور مریخ کے سفر کرنے والا یہ انسان زمین پر سب سے زہریلی شے ہے ان دونوں۔ بس ان لفظوں کے ساتھ میں اپنی بات ختم کرتی ہوں۔''

گوہ نے اپنی گردن اسٹینڈ پر رکھے ہوئے کیمرے کی طرح گھمائی۔ تمہیں کچھ کہنا ہے۔ ایک مغربی چھپکلی کی طرف دیکھتے ہوئے گوہ نے استفسار کیا۔

''ہم سب کا ایک ہی مسئلہ ہے جسے ہماری ایک ساتھی نے بیان کر دیا۔ اس نے مختصر سا جواب دیا۔ گوہ کے چہرے پر فکر کی لکیریں زیادہ گہری ہو گئی تھیں۔ مسندِ صدارت پر اس کے ساتھ اور بھی بزرگ گوہ اور چھپکلیاں موجود تھیں۔ ٹوپی اتار کر سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ پھر گویا ہوا۔ ''ساتھیو! اچھا ہوا کہ آپ ابھی سے جیت گئے ورنہ مستقبل میں اس کے نتائج زیادہ بھیانک ہوتے۔ ابھی بات اتنی نہیں بگڑی ہے۔ آنے والے دنوں میں آپ

www.urduchannel.in

کی حیثیت ڈائنا سور جیسی ہوتی۔ میرے ساتھ بھی کسی حد تک یہی ہوا اور شاید یہی وجہ ہے کہ کسی آدمی کو دیکھتے ہی میں نفرت وحقارت سے اس کی طرف تھوک دیتا ہوں۔ نفرت کا وہی زہر میں اب آپ کی آنکھوں میں دیکھ رہا ہوں۔ لمبی چوڑی تقریر کرنا مقصد نہیں ہے۔ ہم نے آپس میں اس پر کافی گفتگو کی ہے۔ اس کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں۔ اس جگہ سے دفاع کے صرف دو ہی راستے بچے ہیں پہلا یہ کہ آپ صحرا کی طرف کوچ کر جائیں۔ جنگل میں اس لیے نہیں کہہ رہا کہ شہر اور اس کے درمیان حدود کا امتیاز ختم ہو گیا۔ مجھے احساس ہے کہ میں زیادہ جذباتی ہو گیا ہوں پر افتاد ہی ایسی پڑی ہے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ آپ اپنی افزائش نسل پر قدغن لگا دیں۔ اس کے لیے خواہ اپنے ہی ہاتھوں سے اپنی نسل کو کیس ٹریٹ ہی کیوں نہ کرنا پڑے؟'' سارا ماحول چھپکلیوں کے غصے اور غضب سے کانپنے لگا۔ تمام چھپکلیاں تھوک کر اپنی نفرت کا اظہار کر رہی تھیں۔

صبح دس بجے میری آنکھ کھلی تو سب سے پہلے میری نگاہ سامنے ٹیوب لائٹ اور گھڑی کے وسط کی دیوار پر پڑی۔ وہ جگہ خالی تھی۔ میں نے انگلیوں سے آنکھیں صاف کیں اور دوبارہ زیادہ غور سے دیکھا لیکن واقعی وہاں کوئی چھپکلی نہیں تھی!

(ماہنامہ 'آجکل' نئی دہلی۔ جنوری 2012ء)

❁❁❁

چھوٹے بڑے دائرے

فارحہ بجلی کی سرعت کے سے گھر میں داخل ہوئی۔ چہرے کی رنگت اڑی ہوئی تھی جیسے زادِ سفر لٹ گیا ہو۔ ایک اچٹتی سی نگاہ ڈال کر اندر کا جائزہ لیا۔ امی باورچی خانے میں تھیں۔ چھوٹی بہن ثمرین اپنی دوست کے ساتھ صحن میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی دوست نے فارحہ کو سلام کیا۔ اس نے سر کو آہستہ سے جنبش دے کر جواب دیا اور ایک ساعت بھی وہاں رکے بغیر کمرے میں داخل ہو گئی۔ بیگ ابھی میز پر رکھا ہی تھا کہ جھر جھر آنسو بہنے لگے۔ رونا تو وہ چیخ چیخ کر چاہتی تھی مگر اُس سے بھی کیا ہونے والا تھا سوائے نقصان کے۔ خواہ مخواہ چار اور لوگوں کو معلوم ہو گا، طرح طرح کی باتیں بنیں گی۔ معلوم تو شاید سب کو ہے یہ نوعیت اور طرح کی ہے۔ پیچھے ثمرین بھی کمرے میں آ گئی۔ باجی کو یوں زار و قطار روتے ہوئے دیکھا تو اس کی تشویش اور بڑھ گئی۔ حالاں کہ معاملے کی نزاکت کا احساس اسے باہر ہی ہو گیا تھا اور اسی وجہ سے وہ اندر آ گئی تھی اگرچہ ابھی وہ بارہ برس کی ہی تھی پر سائبر اور کمپیوٹر عہد کے بچے بھی اتنے ہی ہوشیار ہیں۔

www.urduchannel.in

''اپی کیا..... ہوا..... ؟ کیوں رو رہی ہیں؟

'' کچھ نہیں اور تم اپنا کام کرو..... خبردار جو امی سے کچھ کہا..... تو.....۔''

''کیا..... کالج..... میں کسی..... سے.....؟''

''تم ابھی..... یہاں سے جاؤ۔''اس جواب کے بعد وہ مزید کچھ ہمت نہ کر سکی اور الٹے پیر واپس ہو گئی۔تقریباً دس منٹ تک وہ روتی رہی۔اس ایک جملے کی بازگشت رہ رہ کر کانوں میں گونجتی رہی جو ابھی تھوڑی دیر پہلے ٹمپو میں ایک شرارتی لڑکے نے اس سے کہا تھا۔

''فارحہ بیٹا چائے تیار ہے۔''امی کی آواز پر وہ چونکی۔دوپٹے کے پلو سے آنسو پونچھے۔

''آ..... رہی..... ہوں..... امی.....۔'' کہہ کر جلدی سے اس نے بیسن پر جا کر منہ پر پانی کے چھینٹے مارے۔اسے پتا تھا کہ ذرا بھی دیر ہو گی تو امی چائے کا کپ تھامے کمرے ہی میں چلی آئیں گی۔اس نے تولیہ سے منہ خشک کیا، پھر آئینہ میں اپنی صورت دیکھی۔رونے کے نشان مٹ چکے تھے۔وہ باہر آ گئی۔ابو بھی دفتر سے آ چکے تھے۔اس نے آہستگی سے سلام کیا اور کرسی پر بیٹھ کر چائے سِپ کرنے لگی۔امی بازار جانے کے لیے ابو سے پروگرام طے کر رہی تھیں۔ثمرین کچھ فاصلے پر اپنی سہیلی کے ساتھ اب تک کتابوں میں مصروف تھی، پر نظر بچا کر بار بار فارحہ کو دیکھ رہی تھی، کبھی تجسّس تو کبھی حیرت سے۔فارحہ اس کی آنکھوں سے بچنا چاہ رہی تھی۔اسے خدشہ تھا کہ دیکھنے کے اس انداز سے کسی کو شک نہ ہو جائے۔

''بیٹا، تمہیں تو بازار سے کچھ نہیں منگوانا ہے۔''امی اس کی طرف مخاطب ہوئیں۔اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔چائے کا آخری گھونٹ جیسے تیسے حلق میں انڈیلا اور

واپس اپنے کمرے میں آ گئی۔کرسی پر بیٹھ کر سر میز سے ٹکا دیا۔پورا منظر ایک بار پھر آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔

روز کی طرح آج بھی وہ ٹیمپو میں ایک سہیلی کے ساتھ سوار ہوئی تھی۔چار سواریاں پہلے سے ہی بیٹھی ہوئی تھیں۔سہیلی اپنے اسٹاپ پر اتر گئی۔اس کے اگلے اسٹاپ پر دو اور سواریاں اتر گئیں۔سامنے دو نوجوان بیٹھے ہوئے تھے۔وہ پہلے سے زیادہ محتاط ہو گئی تھی۔نگاہیں ادھر ادھر کیے رہی۔ہوا کی وجہ سے دوپٹہ ایک بار پہلے بھی سرکا تھا پر جلد ہی اس نے سمیٹ کر درست کر لیا تھا۔اسے اندازہ تھا کہ لڑکے مسلسل اسے ہی گھور رہے ہیں۔ایک ساعت کے لیے دھیان جانے کہاں بھٹک گیا کہ دوپٹہ سرک کر اس کی گود میں آ گرا۔اس کا دل دھک سے رہ گیا۔تیزی سے اٹھا کر اس نے ڈال لیا مگر تب تک جملہ اس کے کانوں تک آ چکا تھا''فلیٹ Flat ٹی وی تو دیکھا ہے..... پر.....۔''اسے لگا جیسے بھرے بازار سے ننگا کر دیا گیا ہو۔اس کے رِستے ہوئے زخم پر آج پھر کسی نے مرچ ڈال دیا تھا اور وہ چیخ بھی نہیں سکی تھی۔نفرت و حقارت سے سامنے بیٹھے ہوئے لڑکوں کو دیکھا اور ٹیمپو کو اکر فوراً اتر گئی۔ایک لمحہ اسے لگا کہ شاید وہ بھی اس کے ساتھ اتر آئیں۔اس خیال کے ساتھ اس نے طے کر لیا تھا کہ وہ شور مچا کر بھیڑ جمع کر لے گی لیکن وہ نہیں اترے تھے البتہ قہقہوں کی آواز گھر تک اس کا تعاقب کرتی رہی تھی۔

یہ پہلا واقعہ نہیں ہوا تھا اس کے ساتھ۔اس سے پہلے بھی تذلیل کے اُن پُرخوار راستوں سے وہ جانے کتنی بار گزر چکی تھی۔کیا اپنے، کیا پرائے، کسی نہ کسی بہانے سب نے اسے معتوب ضرور کیا تھا۔فرق صرف اتنا تھا کہ اپنوں کا لہجہ اتنا کرخت نہ ہوتا مگر درد دونوں طریقوں میں برابر کارہا۔ہر بار ایک تیز چھری سی جگر میں اتر جاتی۔سب سے بڑا ستم یہ تھا کہ وہ کسی کو پلٹ کر جواب نہیں دے سکتی تھی۔لوگوں کو تو مزہ آتا ہے۔اس کے کرب کو سمجھنے

www.urduchannel.in

والا کون تھا اس کے سوا۔کبھی کبھی اسے اپنے آپ پر ہی غصہ آجاتا۔زندگی کو ختم کرنے تک کا خیال ذہن میں کوند چکا تھا۔کون جانے کس ساعت اس پر عمل بھی ہو جائے۔

اِس میں اُس کا کیا قصور ہے؟ بارہا نبرد آزما ہو کر خود سے سوال کر بیٹھتی۔یہ سب اس کے اختیار سے باہر کا معاملہ ہے۔جو کوششیں اس سے ہو سکتی تھیں، وہ سب کر کے دیکھ چکی۔اب تو ہار کر بیٹھ گئی ہے۔

شروع میں ایک دو سال تو اس انتظار میں گزر گئے کہ بہتوں کے ساتھ بدن نشو ونما کا ایک وقت متعین نہیں ہوتا۔ڈاکٹر سے رابطہ قائم کیا تو اس نے بھی ایسا ہی کچھ کہا۔اس نے کچھ اطمینان دلایا تو تھوڑی ہمت بندھی، پر جگر گوشوں میں ایک کانٹا سا مستقل چبھا سا ہوتا۔ گھنٹوں آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر خود کو نہارتی کہ شاید مٹی کی پرتوں میں دبی کونپل پھٹ جائیں اور پودوں کے سر باہر نکل آئیں لیکن مایوسی کے علاوہ کچھ حاصل نہ ہوا۔

اب تو وہ بیس برس کی بالغ لڑکی تھی جو نفسیات میں ایم اے کر رہی تھی۔شروع میں امی کے ساتھ کئی ڈاکٹروں سے رجوع کیا، پر کوئی خاطر خواہ فائدہ نظر نہ آیا۔ہارمونز کے جانے کتنے انجکشن لگوائے، لیوا ور زیری ران سیرپ دو چمچ صبح شام کھانے کے بعد مہینوں پیے۔جے پی گریس مساج آئل سے گولائیوں کے آس پاس نرم ہاتھوں سے کئی کئی بار مالش کی پر اتنا سا فرق نہیں پڑا۔اکیلے ہی ماری ماری پھری۔شہر کی کوئی بڑی ڈاکٹر ایسی نہیں تھی جس کے پاس وہ نہ گئی ہو مگر معاملہ وہیں کا وہیں تھا۔حالاں کہ سینہ بالکل سپاٹ نہیں تھا، پر کپڑوں کے اوپر سے گمان ایسا ہی ہوتا۔مسئلہ چھوٹے اور بڑے دائرے کا نہیں تھا۔نہیں سے کچھ ہونے کا تقاضا تھا۔جو کچھ تھا وہ نہ ہونے کے برابر ہی تھا۔

جیسے جیسے وہ بڑی ہوئی، بدن کے اس حصے کی قدر و قیمت کا اندازہ بھی ہوا۔کبھی جھنجھلاہٹ زیادہ بڑھتی تو خالق حقیقی کے لیے بھی حرف شکایت زبان پر آجاتا۔کیسی کالی

کلوٹیوں کے اتنے بڑے بڑے..... اور ایک ..... میں ..... ۔اس سے تو اچھا تھا کہ ایسی شکل وصورت بھی نہ دیتے۔ایسی سرد مہری طاری تھی کہ اکثر و بیشتر اپنے خیالات سے الجھ پڑتی۔اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ اس کا شمار خوبصورتوں میں ہوتا تھا۔خاص طور سے اس کے چہرے کی ملاحت اور بھولپن حسن کو دوبالا کر دیتا۔پہلی ساعت میں دوسروں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرا لیتی مگر اس کی ایک کمی نے تمام خوبیوں پر پانی پھیر دیا تھا۔اب یہ احساس شدت اختیار کر چکا تھا جس کے سبب مزاج میں تھوڑا سا چڑچڑا پن پیدا ہو گیا تھا۔

وہ صحن میں بیٹھی اپنے ہی خیالوں میں الجھی ہوئی تھی، تبھی گلاب کی کیاری کے پاس ایک گیند آ کر گری۔اسے یقین تھا کہ گیٹ کھول کر کوئی بچہ سر جھکا کر کھڑا ہو جائے گا۔سڑک پر کرکٹ کھیلنے والے بچوں کی گیند باؤنڈری کے اندر اکثر آجاتی۔ہر بار ثمرین بچوں کو انتباہ کرتی کہ اب اگر گیند آئی تو وہ واپس نہیں ملے گی۔شاید اسی تنبیہ کا اثر تھا کہ کافی دیر گزر جانے کے بعد بھی کوئی نہیں آیا۔فارحہ نے سوچا کہ وہ خود ہی اٹھ کر بال باہر پھینک دے۔اسے معلوم تھا کہ اطفال ابھی باہر ہی موجود ہوں گے۔ایک بار پھر وہ پگھل گئی۔کرسی سے اٹھ کر آگے بڑھی۔گیند کو اٹھا کر باہر پھینکنے کی بجائے غور سے دیکھنے لگے، غیر شعوری طور پر انگلیوں کے پوروں سے اسے گھمایا۔کچھ ثانیوں تک بغور دیکھتی رہی پھر ادھر ادھر دیکھا، آس پاس کوئی نہیں تھا۔گیند کو تھامے وہ کمرے میں آ گئی۔الماری میں رکھنے سے قبل انہماک سے دیر تک پھر دیکھتی رہی۔ایک صبح وہ سو کر اٹھی تو ثمرین کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئی۔ثمرین کا دوپٹہ پلنگ پر پڑا ہوا تھا۔ایک لمحہ کو اُسے یقین ہی نہ ہوا، پر سچ تو آنکھوں کے سامنے تھا۔جسم کی ساخت ایک رات میں اتنی بدل سکتی ہے۔کل تو اس نے ایسا کچھ بھی محسوس نہیں کیا تھا، پھر آج یہ سب کچھ کیسے ہو گیا؟ چودہ برس کی کچی عمر میں اس کے ابھاروں کا یہ عالم اُسے بار بار حیرت میں ڈال رہا تھا۔نظر بچا کر وہ ثمرین کو موقع ملتے ہی دیکھتی۔کہیں نہ کہیں سے حسد

www.urduchannel.in

کی چنگاریاں سی اٹھتی نظر آئیں۔ایک سرد آہ اُس کے ہونٹوں سے نکلی۔یہ ایک نیا مسئلہ اس کے سامنے آ گیا تھا اور اس سے بھی نجات کے امکان نہیں تھے۔یہ بدن تو اپنے سے بھی زیادہ آنکھوں کے سامنے رہتا ہے۔کہاں تک گریز کر پائے گی وہ؟

فارحہ جب بستر پر جاتی تو ثمرین کی چیخوں کی بازگشت اب اسے مضطرب و بے چین کرتی۔چند مہینے پہلے کی ہی تو بات ہے، ایک رات بے خبر سوتے سے جاگ اٹھی اور رونے لگی۔امی کے ساتھ اس کی بھی آنکھ کھل گئی تھی۔معلوم ہوا سینے پر اس کا اپنا ہی ہاتھ پڑ گیا تھا۔گانٹھ نکلنے میں اتنا درد ہوتا ہے یہ اسے پہلی بار اسی رات کو معلوم ہوا۔پر درد کے بارے میں اس کے شک وشبہات اب تک قائم تھے۔اس مرحلے سے چوں کہ اس کا گزر نہیں ہوا تھا اس لیے اس کے سود وزیاں سے بھی وہ ناواقف تھی۔اب صورت حال پر غور کرتی تو کبھی ششدر رہتی کبھی افسردہ۔حالاں کہ اس وقت اسے ثمرین سے ہمدردی ہوتی۔بہن کا گریہ اس سے نہیں دیکھا جاتا۔وہ بھی ثمرین کی ہمت افزائی کرتی، پر اس معاملے پر غور کرتی تو تکلیف بالکل برعکس پاتی۔خاصہ وقت ہوا ثمرین کے مسائل ابھر چکے تھے۔وہ پوری طرح مطمئن تھی اور خلوت کے اداس لمحوں میں یہ اطمینان ہی فارحہ کے لاشعور کو بے اطمینانی بخش رہا تھا۔کبھی تو اس میں خاصی شدت پیدا ہو جاتی۔

ثمرین اب بڑی ہو گئی تھی۔آنکھوں کی زبان سمجھنے لگی تھی۔بڑی بہن کی ذہنی شکست وریخت زیادہ دنوں تک اس سے بھی پوشیدہ نہ رہ سکی۔نزاکت کا احساس اسے پوری طرح ہو گیا مگر وہ کر بھی کیا سکتی تھی۔معاملہ اس کے بھی اختیار سے باہر کا تھا البتہ اپنے تئیں احتیاط کی جو کوشش ممکن تھیں، اس نے کرنی شروع کر دیں۔ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہنتی ،جھاڑو وغیرہ فارحہ کی عدم موجودگی میں ہی لگاتی۔علاوہ ازیں دوپٹے کو ایک ساعت کے لیے بھی الگ نہ کرتی بلکہ کچھ اتنی چاق وچوبند رہتی کہ وہ شانوں سے بھی نہ ڈھلکنے پائے۔گھر

کی چار دیواری میں آپا سے پردے کا اہتمام آپا سے بھی کتنے دن چھپا رہتا۔اسے ثمرین پر ترس بھی آیا مگر جلن وحسد کی جو چنگاریاں نہاں خانوں میں روشن ہوئی تھیں، اس کی آگ مسلسل بڑھ رہی تھی۔اسے ڈر تھا کہ کہیں اس آتش کدہ میں کسی کا کچھ جل کر خاک نہ ہو جائے۔

فارحہ کو یاد نہیں تھا کہ ہوش سنبھالنے کے بعد وہ پوری رات سکون سے سو پائی ہو۔گھنٹے دو گھنٹے بعد معاً آنکھ کھل جاتی۔کبھی تو ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھتی ورنہ معمول تھا کہ آنکھ کھلتے ہی کبھی اداری اور کبھی غیر ارادی طور پر اس کی انگلیاں اپنے سینے پر اس امید کے ساتھ رینگنے لگتیں کہ شاید ثمرین کی طرح اس کے ساتھ بھی کوئی معجزہ وقوع پذیر ہو جائے، پر نشیب وفراز میں کہیں رتی بھر بھی تبدیلی نہیں ہوئی۔ہر بار سب کچھ پہلے جیسا ہی ملتا، وہ درے جو پہاڑ بننے سے رہ گئے لیکن سینے پر ہاتھ پھیرنے کی ایسی عادت پڑ گئی تھی کہ چھٹنے کا نام ہی نہ لیتی۔ہر طرف سے مایوس ہونے کے بعد امید کی ہلکی سی کرن کبھی معدوم نہیں ہوئی۔کون جانے کس وقت خدا کو اس پر ترس آ جائے اور اس کے پت جھڑ بدن پر سبزہ لہک اٹھے۔

ادھر کچھ دنوں سے اس نے ایک نیا کام شروع کر دیا تھا۔وہ گیند جو اُس نے الماری میں حفاظت سے رکھی تھی، اب سوتے وقت بستر میں اپنے ساتھ لے آتی۔جب تک جاگتی رہتی بال کو انگلیوں کی گرفت میں قید رکھتی۔آنکھ لگ جاتی تو گیند ادھر ادھر لڑھکتی پھرتی، پر آنکھ کھلتے ہی پھر سے ٹٹول لیتی۔جسم کے خالی حصے کو اسپنج کی گیند سے پورا کرنے کا خیال کسی حد تک ذہن کو اطمینان بخش رہا تھا یہ اس کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔

ثمرین اب سولہ برس کی ہو گئی تھی۔حالاں کہ دھان پان سی تھی مگر گولائیوں نے بھی جانے کیا ٹھانی تھی کہ بڑھتے رقبے کی حدود سے بھی تجاوز کر گئی تھیں گو کہ وہ بہت قرینے سے دوپٹہ اوڑھتی پر وہ تھیں کہ اگلی ہی پڑ رہی تھیں۔

www.urduchannel.in

دن رات سوچتے رہنے کی وجہ سے فارحہ کی صحت پر منفی اثر پڑنا شروع ہوگیا۔ ہزار کوششوں کے باوجود وہ اپنا دھیان وہاں سے نہیں ہٹا پاتی۔ وقتی طور پر تو دھیان ہٹ جاتا لیکن فرصت کا ایک لمحہ بھی میسر ہوا اور عفریت کے بگولے اس کے سامنے رقص کرنے لگے۔ کئی بار فیصلہ کیا کہ اب کسی معالج سے بھی رابطہ نہیں قائم کرے گی مگر کچھ دنوں بعد کوئی کسی نئے ڈاکٹر حکیم کا نام بتا دیتا اور نہ چاہتے ہوئے بھی اسے شکستہ قدموں سے وہاں جانا ہی پڑتا۔

اس نے شدت سے محسوس کیا تھا کہ ثمرین سے اس کا فاصلہ مسلسل بڑھتا جا رہا ہے۔ وہ سوچتی کہ دونوں کا مسئلہ یکساں ہونے کے ساتھ برعکس بھی تھا۔ خالق کی اس میں کون سی مصلحت کارفرما ہوگی۔ بے پناہ غور وفکر کے بعد بھی وہ کوئی نتیجہ اخذ کرنے میں ناکام رہی۔ دونوں اپنے طور پر بچپن کے دنوں کو یاد کرتیں کہ کتنا پیار تھا دونوں میں۔ کبھی کوئی چھوٹی سی بات بھی ایک دوسرے نہیں چھپائی۔ ایک کی خوشی دونوں کی خوشی ہوا کرتی تھی اور ایک کا غم بھی دونوں کا ہوتا تھا۔ کتنے عارضی تھے مسرت کے وہ دن بھی۔ اب تو زندگی کے معنی ہی بدل گئے، نہ پڑھائی میں جی لگتا نہ گھر داری میں۔ کیسے حسین خواب دیکھے تھے۔

فارحہ نے اس مسئلے کو سرے سے رد کرنے کے بارے میں بھی بہت سوچا تھا مگر ہر بار مشکلیں پہلے سے زیادہ بڑھی نظر آتیں۔ وہ کوئی پہلی لڑکی تو نہیں تھی جس کے ساتھ ایسا ہوا ہو مگر اور لڑکیاں بھی کیا اسی کرب سے گزرتی ہیں؟ اس کے بارے میں اسے شک تھا پر وہ اتنا جانتی تھی کہ اس سے زیادہ خوفزدہ کوئی نہیں ہوئی ہوگی۔ فام اور پیڈ ووالی بَرا سے تھوڑا سا دھوکا دوسروں کو دیا جا سکتا ہے اپنے آپ کو نہیں۔ اسے ایک ڈاکٹر کا مشورہ اکثر یاد آتا۔ اس نے کہا تھا کہ ''Cosmetic Surgery یا Silicon implement'' کے بغیر بھی اس مسئلے کا حل ہے۔ میڈیکل سائنس نے ایک آلہ ایجاد کیا ہے جو باڈی کے ساتھ دس گھنٹے روز

پہننے سے آٹھ دس ہفتے میں حیرت انگیز نتائج سامنے آتے ہیں۔ اسے 'براوا' کہتے ہیں۔ واکیوم سے چلنے والے اس آلہ میں کٹورے نما پلاسٹک کے کپ ہوتے ہیں۔ براوا پہننے کے بعد اسے ایک چھوٹی مشین سے جوڑتے ہیں جو کپ کے اندر سے ہوا کھینچ کر واکیوم پیدا کرتا ہے، اس کے کھچاؤ سے ہی پستانوں میں سڈول پن اور حسن پیدا ہوتا ہے۔ اس کے After Effects بھی نہیں ہوتے۔'' ایسی باتوں پر اسے ہنسی بھی آئی۔ دوسروں کو مطمئن کرنا ہوتا تو شاید وہ ایسے مصنوعی آلات استعمال کر لیتی مگر یہاں تو شاخسانہ اپنی ہی ذات سے تھا۔ خیالوں کی ساری تان یہیں آ کر ٹوٹ جاتی کہ مسئلہ اپنے جسم کا ہے۔ یہ دو چاند جو عورت کے بدن پر چار چاند نظر آتے ہیں اس کے بدن پر پھوڑے بن گئے تھے۔

ادھر کئی روز سے وہ ثمرین میں غیر معمولی تبدیلیاں محسوس کر رہی تھی جس کا تعلق اس کے مسئلہ سے دور دور تک نظر نہیں آ رہا تھا۔ ہر ہر طرح سے وہ جوڑ گھٹا کر دیکھ چکی تھی، پر مثبت جواب ہاتھ نہیں لگ رہا تھا۔ درمیان میں لحاظ اس درجہ حائل ہوگیا تھا کہ ثمرین سے براہ راست کچھ پوچھنے کی ہمت ہزار کوششوں کے باوجود نہیں جٹا پا رہی تھی۔ ڈرتے ڈرتے امی سے استفسار کیا۔ انہوں نے چونکتے ہوئے بے خبری کا اظہار کر دیا البتہ ثمرین سے باز پرس ضرور کی۔ اس نے امی کے تمام شک وشبہات یہ کہہ کر دور کر دیے کہ پیٹ میں کچھ درد سا ہو رہا ہے، شاید گیس زیادہ بن رہی ہے۔ اسی وجہ سے رات بے رات صحن میں اٹھ کر ٹہلتی ہوں۔ امی نے فوراً ڈاکٹر سے رجوع کرنے کا مشورہ دیا بلکہ صبح اپنے ساتھ لے چلنے کے لیے کہا۔

اگلی صبح سے پہلے کہ امی کچھ کہتیں ثمرین نے بتا دیا کہ پیٹ بالکل ٹھیک ہے، اب آئندہ اگر تکلیف ہوگی تو ڈاکٹر کے یہاں چلوں گی۔

اگلے روز سے اس نے واقعی چہل قدمی ترک کر دی۔ فارحہ نے راحت کی سانس

لی ورنہ اتنے دنوں میں کیسے برے برے خیالات کوند گئے تھے۔

اسی کشمکش میں ایک سال اور گزر گیا۔ فارحہ نے ٹی وی دیکھنا بھی ترک کر دیا تھا ۔سب سے زیادہ وقت Baywatch اور V.I.P پروگرام چھوڑنے کی وجہ سے ہوئی کیوں کہ پہلے اس طرح کے سیریل اسے بہت پسند تھے ۔بیچ میں کچھ وقت کے لیے Panela Arderson کے بین الاقوامی شہرت یافتہ بریسٹ کے معنی اس کی نظر میں بدل گئے ۔وہ اس سے حسد کرنے لگی گو کہ اسے معلوم تھا کہ یہ فطری نہیں ہیں پر اب مزید دیکھنے کی تاب نہیں بچی تھی۔

اب تک کا سارا دھیان بدن کے اسی مخصوص حصے کی طرف کچھ اور ہی وجہ سے لگا ہوا تھا پر آپ ہی آپ اس کے معنی بدل گئے ۔شاید کسی بچے کو ماں کی گود میں دودھ پیتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ذہن میں بنتے اچھے برے خیالی پیکر اپنا روپ بدل کر مقدس نظر آنے لگے۔اس خیال سے کسی حد تک سراسیمہ جذبوں کو تسکین ملی مگر وہ بھی عارضی ثابت ہوئی ۔دھند چھٹنے کے بعد ایک وسوسہ پتا نہیں دودھ کا یہ چشمہ اس کے چٹیل میدان سے کبھی پھوٹے گا بھی یا نہیں ۔اس کا جواب بھی منفی ہی آیا اور ایک بار پھر سب کچھ ویسا ہی ۔ابر آلود..... کہرے سے بھری کائنات چاروں طرف دھندلکا..... کوئی تصویر واضح نہیں۔

ثمرین کئی مہینوں سے بہت اداس نظر آرہی تھی۔یہ بات ہر فرد نے نوٹ کر لی تھی۔خوش ہونے والی باتوں پر بھی وہ نہیں مسکراتی جب کہ ضبط کے باوجود فارحہ کی ہنسی چھوٹ جاتی۔اس بار امی کی تشویش بڑھی۔انہوں نے اکیلے میں بڑے پیار سے بٹھا کر اس سے پوچھا۔کافی دیر تک تو بُت بنی رہی پھر ایکدم سے جیسے ندی کا بند ٹوٹ گیا ہو۔''امی میرے بائیں سینے میں کچھ پرابلم ہے،پچھلے ایک سال سے.....میں نے اس وقت آپ سے جھوٹ بولا تھا۔امی تو بھونچکی اسے دیکھتی رہ گئیں تھیں۔اتنی بڑی بات اتنے دنوں تک

www.urduchannel.in

چھپائے رہی۔مخفی رکھنے کی وجہ امی نہیں معلوم تھی۔گھر میں جیسے زلزلہ سا آ گیا۔

آناً فاناً وہ ثمرین کو لے کر ڈاکٹر کے پاس بھاگیں ۔ڈاکٹر کے چہرے کی لکیریں دیکھ کر امی لرز گئیں۔ڈاکٹر نے اتنی تاخیر کی وجہ پوچھی ۔امی بھلا کیا جواب دیتیں۔انہیں سب سے زیادہ حیرت اس بات پر تھی کہ ثمرین کے چہرے پر خوف و ہراس کا شائبہ تک نہیں تھا۔کیا وہ معاملہ کی نزاکت نہیں سمجھ رہی؟امی نے اپنے آپ سے سوال کیا اور پھر خود ہی جواب دیا کہ ایسا نہیں ہوگا۔اتنی تو ذہین ہے مگر یہ وقت ان باتوں کے سوچنے کا نہیں تھا۔

ثمرین کو باہر بٹھا کر ڈاکٹر نے امی کو صورت حال سے متعارف کرایا۔''میں آپ کو کسی دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتی۔میں نے بچی کا F.N.A.I کیا ہے۔(سوئی کے ذریعہ گاہے کے پانی کی جانچ)Breast Cancer کے امکانات ہیں۔ہر چند کہ ابھی ابتدائی مرحلہ میں ہے لیکن کچھ پہلے آجاتیں تو تشویش کی کوئی بات نہیں تھی ،بائپسی کی ضرورت نہیں پڑتی، پھر بھی آپ پریشان مت ہوں۔

''بیٹی کو کینسر اور مجھے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔''امی کو ڈاکٹر کے بے تکے جواب پر بہت غصہ آیا، پر ڈاکٹر سے الجھنا ٹھیک نہیں، یہ سوچ کر وہ خاموش رہیں۔دو روز بعد ہی ثمرین کو ہسپتال میں داخل کرا دیا گیا۔آپریشن ہو گیا اور کامیاب بھی۔جیسا کہ ڈاکٹر نے بتایا تھا۔کچھ ہی دنوں میں چھٹی ہوگئی ۔بس ڈریسنگ کے لیے آنا تھا۔ہفتوں کے بعد لوگوں کے چہرے پر کچھ راحت دکھائی دی تھی ۔آگے بھی کچھ دنوں تک حالات بہتر ہی ہوتے نظر آئے۔پر کسے معلوم تھا کہ بات یہاں ختم نہیں ہوگی۔ڈاکٹر بھی کس منہ سے اور کیوں بتاتے کہ اس زخم میں بلیڈ لگنا عام طور سے خطرناک ہوتا ہے۔

Infection کی وجہ سے بھی زخم اور زیادہ بڑھ گیا۔ماں باپ اسے فوراً لے کر بمبئی بھاگے۔وہاں سہولتیں زیادہ تھیں۔بڑے ڈاکٹرز تھے۔باریکی سے جانچ پڑتال ہوئی

www.urduchannel.in

،پورا کیس سمجھا گیا ،اپنے طور پر اقدامات ہوئے۔مہنگی دوائیں لکھی گئیں، پرافاقے کی صورت نظر نہیں آرہی تھی۔بیس دنوں کے بعد ڈاکٹر نے جواب دے دیا اور وہ ناکام لوٹ آئے۔

گھر کے ہر فرد پر سکتہ سا طاری تھا۔انہیں یاد نہیں تھا کہ وہ کبھی مسکرائے بھی تھے۔اور تو اور ایک دوسرے سے بات تک کرنے کی ہمت نہیں ہوتی۔سب اس بات پر حیران تھے کہ اتنی بڑی بات ثمرین نے چھپائی کیوں، وہ بھی اتنے دنوں تک۔ہر کوئی ایک دوسرے سے چھپ کر رو رہا تھا۔فارحہ کا حال سب سے برا تھا۔ثمرین کا اضطراب اس نے دیکھا تھا حالاں کہ اس عذاب کا تو وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی پر کہیں نہ کہیں احساس جرم کچو کے لگا رہا تھا۔اس کے ہنستے کھیلتے گھر کو کس کی نظر لگ گئی۔خدا کی طرف سے اتنی بدظن ہوئی کہ جمعہ کی بھی چھوڑ دی۔فارحہ بیڈ کی ریک سے ٹکی دیر تک اسی ادھیڑ بن میں رہی۔دل چاہ رہا تھا کہ دھاڑیں مار مار کر روئے۔ثمرین کی تڑپ اب کسی سے نہیں دیکھی جا رہی تھی۔وہ ذرا دیر میں اٹھ کر تیز قدموں سے چلنے لگتی۔رات میں درد کی شدت سے اوروں کی آنکھ بھی کھل جاتی۔ویسے بھی عرصہ ہوا گھر میں سکون کی نیند آئی ہی کس کو تھی۔

امی اور فارحہ نے کئی بار زخم دیکھنے کی کوشش کی، پر ثمرین نے نہیں دیکھنے دیا۔وہ خود ڈریسنگ کرتی۔ایک بار میں گھنٹے بھر سے زیادہ لگتا اور اتنی ہی دیر بعد اسے پھر کمرے میں بند ہونا پڑتا۔امی وغیرہ تو صرف خون سے سنی روئی اور کپڑے دیکھ کر ہی لرز جاتیں۔

فارحہ کے کانوں میں ثمرین کے اس درد کی بازگشت بھی گونجتی، جب اس کے ابھار سے شروع ہوئے تھے۔اس مرحلے سے چوں کہ وہ نہیں گزری تھی اس لیے کرب کا اندازہ صرف اس کی آہ وفغاں سے لگاتی۔کبھی دھوکے سے بھی اس کا ہاتھ چھو جاتا تو جیسے جان نکل جاتی،ثمرین کی سسکی بھی سنائی دیتی۔فارحہ کے ذہن میں یہ بات بھی آئی کہ اس خطرناک

بیماری کا آغاز تب سے نہ شروع ہوا ہو مگر معاملے کی ہولناکی کا اندازہ کسے تھا۔ثمرین نے اسی کی وجہ سے بات پوشیدہ رکھی تھی۔اتنی بڑی سزا وہ کیسے کاٹ پائے گی۔

فارحہ خاموش آنکھوں سے ثمرین کو دیکھ رہی تھی۔کتنی حیرت انگیز تبدیلیاں تھیں اس میں۔کتنی نازک اور ڈرپوک لڑکی تھی یہ یقین ہی نہیں ہوتا۔اتنی ہمت اور ایثار کے جذبے گپ چپ کہاں سے سیکھ لیے۔اپنی موت کی باتیں اس طرح کرتی کہ کسی دشمن کی بھی تو کچھ لحاظ آئے۔امی گود میں سر رکھ سب جھٹلا دیتیں۔

بیس دن کے وقفے میں انجکشن لگوانے ہسپتال جانا پڑتا۔اس بار اس نے صاف انکار کر دیا۔''خواہ مخواہ ڈھائی ہزار روپے پھینکنے سے کیا فائدہ، مجھے معلوم ہے میں نہیں بچوں گی۔''اس کے بعد اس کا لہجہ ایکدم بدل گیا۔جیسے آسمان سے کوئی نور کا پیکر ماں کی گود میں سرگوشیاں کر رہی ہو۔''امی پتا ہے کل میں نے خواب میں قبرستان دیکھا۔میں باہر دروازے کے پاس کھڑی تھی۔بیشمار قبریں میرے سامنے تھیں،اگربتی اور کافور کی خوشبوئیں میرے آس پاس سے آرہی تھیں۔ٹھنڈی اور پرسکون ہوا..... کہتے کہتے.....اس نے آنکھیں موندلیں۔امی کو بھنک تک نہیں لگی کہ کب اس نے آخری سانس لے لی۔

گھر میں کہرام برپا ہو گیا۔درودیوار تک رو رہے تھے۔فارحہ تو بیہوش ہو گئی۔آناً فاناً میں سب کچھ ہو گیا کہ کسی کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔موت کا تصور اور موت ہو جانے میں فرق ہے۔جس نے سنا ہانپتا کانپتا ہوا دوڑ آیا۔ایسی جوان موت پر ہر شخص دم بخود تھا، ہر آنکھ نم تھی۔جنازہ اٹھا تو بارش شروع ہو گئی۔شاید گردوں کا صبر بھی ٹوٹ گیا تھا۔ہمسایوں نے ایسے وقت میں جو اخلاقی ذمہ داری تھی خوب اچھی طرح نباہیں۔دو چار روز بعد قریبی رشتہ دار بھی رخصت ہو گئے۔گھر کے ہر کونے میں ویرانی چھائی ہوئی تھی۔لوگ بعد میں بھی کئی دنوں تک برابر آتے رہے اور جان بوجھ کر دنیا کی باتیں چھیڑتے تاکہ کچھ ذہن بٹنے پر ایسے

www.urduchannel.in

وقتوں کے لیے وقت ہی آخری اور واحد علاج ہے۔

تقریباً دو ماہ بعد فارحہ گہری نیند سوئی تھی۔ وہ بھی نہ چاہتے ہوئے پر بے طرح تکان اور مسلسل رونے جاگنے کی وجہ سے پپوٹوں پر ورم بھی آ گیا تھا۔ وہ سالوں کی بیمار لگنے لگی تھی۔ رات کے کسی پہر کروٹ لیتے ہوئے اس کی نیند ٹوٹ گئی پر آنکھ نہیں کھلی۔ غیر ارادی طور پر انگلیاں رینگتی ہوئی سینے پر آہستگی سے آگے بڑھ رہی تھیں۔ اچانک وہ ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھی۔ سانسوں کا زیر و بم منتشر ہو گیا تھا۔ غنودگی کی کیفیت جانے کہاں غائب ہو چکی تھی۔ ایک لمحہ کو لگا جیسے پوروں میں گیند دبی ہو۔ وہ اندر تک لرز گئی۔ چہرے پر ہی نہیں خوف ہڈیوں تک اتر گیا تھا۔ چند ثانیوں تک وہ کانپتی رہی پھر ایکدم بجلی کی سی تیزی سے اٹھی، الماری میں حفاظت سے رکھی ہوئی بال اٹھائی اور صحن میں آ کر رات کی تیرگی میں گیند کو پوری طاقت بٹور کر باہر اتنی دور پھینک دیا کہ دوبارہ اس کی پرچھائیں تک چار دیواری میں نہ آ سکے۔ واپس لوٹی تو محسوس ہوا جیسے کوئی بہت بوجھ دماغ سے اتر گیا ہو۔ وہ آنسو اس بار بھی رخساروں پر ڈھلک آئے تھے۔

(سہ ماہی 'مباحثہ'، پٹنہ۔ شمارہ نمبر:)

❁❁❁

مشاہیر کی آرا

☆ شاہد اختر نئی نسل کے ایک تازہ کار افسانہ نگار ہیں جو اپنے افسانوں سے چونکاتے ہی نہیں بلکہ سبھوں کی توجہ اپنی طرف مبذول بھی کرا لیتے ہیں۔ 'الرشدیان'، 'پلوشن'، 'سچ اور جھوٹ کے درمیان' اور 'برف پر ننگے پاؤں' وغیرہ ایسے افسانے ہیں جس نے مجھے ہی نہیں بلکہ ادب کے پر ایک بڑے حلقے کو بھی ششدر کیا ہے۔ شاہد اختر فکشن کی عصری حسیت سے آگاہ اور اظہار و بیان کی جمالیات کے رمز شناش ہیں۔ ان کی کہانیوں میں خوبیاں تو بہت سی ہیں مگر 'بولڈ اور بیوٹی فل' ایک ایسی خوبی ہے جو انھیں دوسرے افسانہ نگاروں سے ممیّز کرتی ہے۔ شاہد اختر بڑی تپسیا کے بعد فکشن کی آرادھنا میں سپھل ہوئے ہیں۔

(پروفیسر گوپی چند نارنگ)

☆ ۱۹۹۰ء کے بعد جو افسانہ نگار سامنے آئے ہیں اُن میں شاہد اختر کا نام سب سے نمایاں ہے۔ وہ بہت بہتر لکھ رہے ہیں۔

(پروفیسر نیر مسعود)

www.urduchannel.in

☆ شاہد اختر کا فکشن زندگی کے ہمہ گیر محسوسات کو گرفت میں لینے اور تجزیاتی یا مفہومی تاثر قائم کے بغیر اے ناظر کی نگاہ سے افسانوی سچویشن دیکھنے کا عمل ہے۔انھوں نے Surrealistic انداز میں منظر نامہ کو کردار بنانے کا انفرادی عمل تخلیق کیا ہے اور فکشن کو ایک جہتی مفہوم کے بجائے ہمہ جہتی مفاہیم میں تبدیل کرنے کی کوشش کی ہے۔شاہد اختر کے افسانوں میں نفسیاتی دروں بینی نہیں بلکہ نفسیاتی تصورات کا اجتماعی اثر اور تہذیبی زوال کے وہ زلزلے نمایاں ہوتے ہیں جو کو دیکھ کر پڑھنے والا خود بھی لرزہ براندام ہو جاتا ہے۔

(محمود ہاشمی)

☆ نئے لکھنے والوں میں شاہد اختر نے مجھے بہ طور خاص متاثر کیا ہے۔ مجھے ان سے بہت امیدیں وابستہ ہیں ''ربو'' پڑھ کر تو میں حیرت زدہ رہ گیا۔

(پروفیسر سید محمد عقیل)

☆ شاہد اختر کا افسانہ ''ایک بلی کی موت'' پڑھ کر احساس ہوا کہ لکھنے والا بہت ذہین اور طناع ہے۔

(پروفیسر شمیم حنفی)

☆ شاہد اختر کے افسانے عصری، معاشرتی، سماجی تضادات اور اقدار کے زوال کی جس انداز میں تجسیم کرتے ہیں وہ ان کی تخلیقی قوت کا حوالہ ہے۔ان کے لکھنے کی صلاحیت کی داد دیتا ہوں۔

(بلراج کومل)

☆ شاہد اختر کی تحریں میں گہرے اندھیروں میں بھی روشنی کی ان کرنوں سے دور نہیں ہوتیں جو کو دردمندیوں نے فنکارانہ آب وتاب عطا کی ہے۔ان کی کہانیاں بھی مجھے پسند ہیں اور ان میں جس زبان کا استعمال کیا گیا ہے، اس کی روانی، سادگی اور شفافیت بھی متوجہ کرتی ہے۔

(ندا فاضلی)

☆ جنس میں مستتر تخلیقی امکانات کو شاہد اختر نے جس طرح خاطر نشان کیا ہے، اس کی مثال شاذ ہی ملتی ہے۔شاہد اختر کے افسانے بیانیہ کی بحالی کے ضمن میں مثال کے طور پر پیش کیے جا رہے ہیں۔ان کے افسانوں میں جو چیز سب سے زیادہ توجہ انگیز ہے وہ اس کی Story Line ہے۔

(پروفیسر شافع قدوائی)

☆ شاہد اختر کی دنیا نئی ہے۔میری مراد ان کے افسانے کی فضا بندی سے ہے۔یہ اپنے بولڈ انداز کی وجہ سے صاف پہچانے جاتے ہیں۔ان کا مستقبل ہر لحاظ سے روشن معلوم ہوتا ہے۔

(پروفیسر وہاب اشرفی)

☆ میرا خیال ہے کہ نئی نسل میں شاہد اختر ایک اہم ترین کہانی کار ثابت ہوں گے اور فکشن کا مستقبل ان کے نام سے معنون ہوگا۔

(عبدالصمد)

www.urduchannel.in

☆ شاہد اختر کے یہاں علامت اور استعارے ایسے بے ساختہ اور فطری طور پر در آتے ہیں کہ ان پر تصنع کی گرد کا ایک زرہ بھی نظر نہیں آتا۔ زبان کے ساتھ یہ رویہ حیرت کی حد تک مستحسن ہے۔ ان کے یہاں بھی منٹو کی طرح بمبئی اور اس کے پس منظر کی ایک خاص اہمیت ہے مگر دونوں کی بمبئی میں بہت نمایاں فرق ہے جسے ہم وقت کا جبر کہہ سکتے ہیں۔ اب مسائل اور موضوعات زیادہ پیچیدہ ہو گئے ہیں۔

(شعیب نظام)

☆ شاہد اختر نے اپنی کہانیوں میں عورت مرد کے رشتوں، جنسی و جذباتی رویوں کو بڑی باریکی اور نزاکت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ عورتوں کے مزاج، کمزوری اور جذباتیت کو لے کر بڑے خلاقانہ جملے بھی قلم سے نکالے ہیں۔ یہ کہانیاں ان کی محنت، ریاضت اور بھرپور تخلیقیت کی غماز ہیں۔ یہ کہانیاں فرد و معاشرہ کے درمیاں تلخ و شیریں واقفیت و حقیقت، مال و معاش نقدیمیت پر گہرا تاثر پیش کرتی ہیں۔

(پروفیسر علی احمد فاطمی)

مصنف کی دیگر کتابیں

(1)	برف پر ننگے پاؤں	(افسانے)	2001ء
(2)	شہر میں سمندر	(ناول)	2005ء
(3)	مونٹی	(افسانے)	2008ء